|o\Alsera

ڈاکٹر نثار احمد☆

مخالفت قریش کے اسباب

نوعیت، اسباب، احوال، تاریخ

﴿۲﴾

ابوجہل کے بارے میں اگرچہ بعض مشہور باتیں درست ہیں، اور یہ بھی درست ہے کہ مخالفت و عداوت رسول کو ایک جاندار تحریک بنانے میں اس کا حصہ شاید سب سے زیادہ تھا۔ تاہم یہ بات بھی عین حقیقت ہے کہ اظہار عداوت، انکار دعوت او راستر داد رسالت میں اولیت اور تقدم کا حق دار وسزاوار ابولہب ہی تھا، اور اس کے کفر وانکار میں شریک او راذیت رسانی رسول میں شامل اس کی بیوی ام جمیل تھی۔ ان دونوں کا معاندانہ رویہ نہ صرف یہ کہ عوام الناس کی نگاہوں کے سامنے تھا، بلکہ اللہ کی نگاہ میں بھی تھا۔ ان دونوں کا یہی کردار غیرت ربانی کو جوش میں لانے کا سبب بنا او رقرآن میں نام و عرفیت کی تصریح کے ساتھ ان دونوں میاں بیوی کے مکروہ کردار، اور ہولناک انجام کو عداوت رسول کے باب میں ہمیشہ کے لئے ثبت کردیا گیا۔ (۹۹) جب کہ دوسرے دشمنان خدا و رسول، یعنی ابوجہل، ولید بن المغیرہ، عاص بن وائل السہمی، نضر بن الحارث وغیرہ کے بارے میں ایسے اشارے کنائے مختلف سورہائے قرآن میں منقول ہیں جن کی رو سے ان روسیاہوں کو صاف پہچانا جاسکتا ہے، تاہم ان کے ناموں کی صراحت قرآن میں کہیں موجود نہیں۔

تاریخی اعتبار سے بھی ابولہب کی عداوت و مخالفت کا آغاز حضور ﷺ کے علانیہ اظہار دعوت کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا (۱/۹۹)۔ چنانچہ مؤرخین اور اصحاب سیر نے جو واقعات نقل کئے ہیں، ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کا حقیقی چچا ہونے کے باوجود آپ کے اپنے خاندان والوں میں سے ابولہب ہی وہ شخص تھا جس نے پہلے پہل تبلیغ رسالت میں روڑے اٹکائے، آپ ﷺ کی دعوت سے انکار کیا، آپ کی حوصلہ شکنی کی، اور آپؐ کے خلاف علم مخالفت بلند کیا۔ اور محض ذاتی وجوہ سے، جس کی کوئی منطق نہیں تھی، گویا بلاوجہ اپنے سگے بھتیجے کی جان اور پیغام کا دشمن بن گیا، مگر اسلام لے آنے پر جب بھانجے حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی نے جناب ابو طالب کی حفاظت و حمایت میں آنا چاہا تو خود ابولہب ہم نوا بن کر حفاظت و

☆سابق رئیس کلیہ فنون وصدر شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی

Alsera

حمایت میں آگے آ گیا (۱۰۰)۔ یعنی جو رعایت بھانجے کو دے رہا تھا بھتیجے کو دینے پر تیار نہیں تھا۔

حضور ﷺ پر جب آیت وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ" اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے"۔(۱/۱۰۰) نازل ہوئی تو اس کی تعمیل میں آپ ﷺ نے ایک طرف تو اپنے تمام خاندان والوں کو کئی بار اپنے گھر پر کھانے کی دعوت کا اہتمام کر کے پیغام حق سنانے کے لئے جمع کیا، اس وقت بھی آواز مخالفت بلند کرنے والا یہی چچا ابولہب تھا۔(۱۰۱) پھر جب دوسری طرف قوم کو مخاطب کرنے کے لئے حضور ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر پکارا (۱۰۲) تو اس خطاب کے موقع پر بھی سب سے پہلے زبان طعن دراز کرنے والا، آپ کا برا چاہنے والا اور یہ کہنے والا ابولہب ہی تھا۔ پھر جب کار رسالت میں اضافہ ہوا اور آنحضرت ﷺ شہر سے باہر مضافات مکہ، قبائل کی خیمہ گاہوں میں موقع بہ موقع تبلیغ رسالت کے لئے تشریف لے جانے لگے تو ایسے مواقع پر بھی ابولہب آنحضور ﷺ کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا، مثلاً امام احمد نے یہ روایت نقل کی ہے کہ سوق عکاظ (مکہ معظمہ) میں ایک طرف سے تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم یہ فرماتے ہوئے نمودار ہوتے کہ **قولوا لا الہ الا اللہ تفلحو**(۱۰۳)" لوگو! لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلو تو فلاح و نجات پا جاؤ گے"۔ پھر لوگ ارد گرد جمع ہو جاتے تھے یہاں تک کہ ایک آدمی پیچھے سے نمودار ہوتا، روشن چہرہ والا مگر بھینگا، اور یہ کہتا جاتا کہ لوگو خبردار! یہ بے دین ہو گیا ہے، جھوٹا ہے۔ پھر داعی حق ﷺ جہاں جہاں تشریف لے جاتے یہ نامراد (ابولہب) ان کے پیچھے ہو لیتا (۱۰۴)۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ حضور ﷺ موسم حج میں ایک ایک قبیلے کی قیام گاہوں پر جاتے اور فرمایا کرتے: اے فلاں، فلاں، میں تم لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ (۱۰۵)۔

ابولہب کی یہ مخالفانہ جارحانہ سرگرمیاں بظاہر اس کی اپنی نفسانی تحریک کے سبب تھیں، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر کتنا زہر بھرا ہوا تھا۔ سید الرسل ﷺ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ، اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا ابولہب کے دو لڑکوں کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ اس نے لڑکوں کو مجبور کر کے انہیں طلاق دلوا دی، تا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بارے بوجھل ہو جائیں اور اس کے بغض و حسد کی تسکین کا سامان ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ جب ذاتی اور انفرادی سطح پر عداوت خدا اور رسول میں وہ کوئی دقیقہ فروگزاشت روا نہ رکھتا تھا تو قریش کی اجتماعی معاندانہ سرگرمی سے کس طرح بے تعلق رہ سکتا تھا۔ قریش نے جب اپنے تئیں بنو ہاشم کے خلاف معاشی اور معاشرتی مقاطعے کا فیصلہ کیا تو وہ ان کا ہم نوا بن گیا اور خود اپنے ہی خاندان بنو ہاشم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ حالانکہ جناب ابو طالب کی قیادت میں بنو ہاشم

o\Alsera

نے نبی اکرم ﷺ کی حمایت کا فیصلہ کیا اور تمام تر شدائد کے باوجود ثابت قدمی دکھائی۔ یہ مقاطعہ تین سال یعنی ۷تا۱۰ نبوی جاری رہا۔ جناب ابو طالب کے انتقال کے بعد ۱۰ نبوی میں بنو ہاشم کی سربراہی ابولہب کے حصے میں آئی تو اس نے پرانا غبار نکالتے ہوئے آنحضور ﷺ کو قبیلے کی حمایت سے ہی محروم کر دیا۔

مختصر یہ کہ کی عہد نبوت کے پورے دور میں ابولہب اور اس کی بیوی کی بھرپور عداوت و مخالفت کا محور و مرکز حضور رسالت مآب ﷺ کی ذات بابرکات کے علاوہ دوسرا کوئی نہ تھا۔ اور مولانا حمید الدین فراہی کی تحقیق یہ ہے کہ مخالفین اسلام میں سے نام کے ساتھ صرف ابولہب کے ذکر اور اس شدت سے اس کی مذمت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کی مخالفت کسی اصول یا اپنے مذہب یا قوم کی حمیت کے تحت نہیں، صرف زر پرستی کے گھٹیا جذبے کے تحت تھی (۱۰۷)۔

ظہور دعوت نبوی ﷺ کے ساتھ ہی ابولہب ہاشمی کی دشمنی و مخالفت کا آغاز یہ ثابت کرتا ہے کہ مخالفت قریش میں اصل کارفرمائی قبائلی و خاندانی عصبیت کی نہیں تھی، بلکہ ایک بڑی وجہ ذاتی، انفرادی و شخصی منافرت تھی، جس میں کبر و نخوت، ذاتی انا اور مخالفت برائے مخالفت کے جذبے نے شدت پیدا کر دی تھی۔

عمرو بن ہشام یعنی ابوجہل شدید مخالفین میں سے تھا، اور جیسا کہ واٹ نے لکھا ہے نمایاں ترین دشمن بھی۔ وہ بنو مخزوم (سربراہ ولید بن مغیرہ) کا ایک بااثر رکن ہونے کے ساتھ ساتھ کی جاہلی معاشرے میں بھی بہت اثر رسوخ رکھتا تھا، اور کی معاملات میں اثر و رسوخ کا مدار دو باتوں پر تھا۔ ایک خاندان و قبیلہ اور دوسرے ذاتی صفات و خصوصیات۔ اس کا خاندان بنو مخزوم بھی کی سیاست میں بااثر سیاسی گروپ تھا (۱۰۷/۱) جب کہ وہ خود بھی امتیازی خصوصیات کا حامل تھا، یعنی عقل مند، صائب الرائے، تیز و طرار، اسے ابو الحکم کہا جاتا تھا۔ نت نئی منصوبہ بندی کا ماہر، عملی اقدام کے لئے ہمت و حوصلہ اور جوش و جذبہ رکھنے کے علاوہ سخت جان، متحرک شخصیت کا مالک، اور اپنی اولوالعزمی سے معمولی چیز کو بہت کچھ بنا دینے والا۔ اس کا مدمقابل اور ہم پلہ بنو عدی کے عمر بن الخطاب کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ آنحضور ﷺ نے دعوت اسلام کے ابتدائی دور میں ان ہی دو شخصیات میں سے کسی ایک کے ایمان لے آنے کی تمنا فرمائی تھی، (۱۰۸)۔ ان میں سے ایک یہی ابوجہل تھا، جو توفیق ایمان سے محروم رہا اور سیرۃ ابن اسحاق میں مندرج اس شعر کا مصداق ٹھہرا جس کا مفہوم ہے وہ بنو مخزوم کا احمق تھا جو گمراہ کرنے والوں کی گمراہی کے باعث گمراہ ہو گیا اور اس نے نبی ﷺ کی تصدیق نہ کی (۱۰۹)۔ جب کہ دوسری شخصیت عمر بن الخطاب مراد نبوی بن کر دولت ایمان سے سرفراز ہوئے، اور ان کے ایمان لاتے ہی حرم کی خاموش فضا اللہ اکبر کی صداؤں سے گونج اٹھی (۱۱۰)۔

ابو جہل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عداوت خدا و رسول کو ذاتیات سے آگے بڑھا کر ایک تحریک بنا دیا، وہ اس پر نظر رکھتا کہ شہر میں کون دعوت محمدی سے متاثر ہو رہا ہے۔ اگر وہ مالی، معاشی، سماجی اعتبار سے کمزور ہوتا تو اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بنانے سے گریز نہ کرتا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی مدد و حمایت اور پشت پناہی کرنے والا کوئی نہیں۔ جو ذرا بہتر حالت میں کاروباری قسم کے لوگ ہوتے ان پر دھونس جماتا، دھمکی دیتا کہ کاروبار ٹھپ کرا دوں گا، مال نہیں بکنے دوں گا وغیرہ وغیرہ، جو صاحب ایمان ذرا با اثر ہوتا، اس کی غیرت کو للکارتا، لعن طعن کرتا، او رمعبودان باطل کے نام پر ترک اسلام کی اپیل کرتا (۱۱۱)۔ دوسرے سرداران قریش پر اثر انداز ہو کر انہیں مجبور کرتا کہ وہ رسول عربی ﷺ کے خلاف متحدہ محاذ بنائیں، بنو ہاشم کے خلاف سب مل کر اجتماعی قدم اٹھائیں۔ چنانچہ ابو جہل وفد بنا کر کئی مرتبہ جناب ابو طالب کے پاس گیا اور ان کو ان کے بھتیجے کے خلاف فردِ جرم سے آگاہ کیا۔ اس کی کوششوں سے بنو ہاشم کا معاشی معاشرتی مقاطعہ کیا گیا، اور بالآخر اس کی تجویز پر حضور ﷺ کی شمع حیات گل کرنے کا شیطانی منصوبہ بنایا گیا کہ ہجرت کی رات تمام قبائل کے منتخب جوان کاشانۂ نبوی کا محاصرہ کر کے قتل کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ساتھ ہجوم کریں۔ یہ تمام مکارانہ چالیں اگرچہ کامیاب نہیں ہو سکیں لیکن ان سے ابو جہل کے کافرانہ عزائم، شیطانی دماغ اور فرعونی خناس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اس فرمان رسول ﷺ کی معنویت واضح ہوتی ہے جس میں ابو جہل کو اس اُمت کا فرعون کہا گیا ہے (۱۱۲)۔

اس کے خبث باطن کی انتہا یہ تھی کہ وہ حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ کو زک پہنچانے میں انتہائی بے باک ہو گیا تھا۔ اصحاب سیر نے متعدد واقعات نقل کئے ہیں، مثلاً ایک دن اس نے اپنے ہم نواؤں کے سامنے یہ شیخی بگھاری کہ اگر اب میں نے آپ ﷺ حرم میں نماز پڑھتے دیکھ لیا تو دوران نماز ان کی گردن کو کچل دوں گا۔ اس غرض سے اس بد باطن نے ایک بڑا سا وزنی پتھر دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور آپ ﷺ کی طرف بڑھا، جو حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان بحالت سجدہ مصروف نیاز تھے، سب کی نظریں اس طرف لگی تھیں، او ر ابھی وہ دائرۂ قربت میں نہ پہنچا تھا کہ وحشت زدہ ہو کر اچانک پلٹا، اس کے ہاتھ بے جان ہو گئے، پتھر اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور نا کام و نامراد منہ لٹکائے اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ گیا، جو تماشے کے منتظر تھے او ر تماشہ نہ ہوا۔ جب اس کے حواس بجا ہوئے اور لوگوں نے پوچھا کہ کیا ماجرا ہوا تو ابو جہل کہنے لگا میں جب ان کے قریب پہنچا تو میرے اور ان (ﷺ) کے درمیان ایک سانڈ اونٹ حائل ہو گیا، بخدا میں نے کبھی ایسا کوئی اونٹ نہیں دیکھا جس کا سر اور گردن اور دانت اس اونٹ جیسے ہوں وہ اونٹ مجھے کھانے کے

لئے لپکا (۱۱۳)۔علامہ ابن کثیر نے سورۃ العلق کے دوسرے حصے (آیات ۶ تا ۱۹) کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ابو جہل کے بارے میں نازل ہوا (۱۱۴))اس کی تفصیل میں کئی روایات اور واقعات نقل کئے ہیں، مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ابو جہل نے (قریش کے لوگوں سے) پوچھا کہ کیا محمد ﷺ تمہارے سامنے اپنا منہ زمین پر ٹکاتے ہیں۔لوگوں نے کہا ہاں، اس نے کہا کہ لات وعزیٰ کی قسم! اگر میں نے ان کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے پھر دیکھا تو ان کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور منہ زمین سے رگڑ دوں گا۔(۱۱۵))پھر ایسا ہوا کہ حضور ﷺ کو نماز پڑھتا دیکھ کر وہ آگے بڑھا تا کہ آپ کی گردن پر پاؤں رکھے، مگر یکا یک لوگوں نے دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔اس سے پوچھا گیا یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے کہا میرے اور ان کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہولناک چیز تھی اور کچھ پر تھے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو فرشتے اس کا جوڑ جوڑ الگ کر کے چیتھڑے اُڑا دیتے (۱۱۶)۔

ابو جہل کی ذاتی شیطنت و خباثت، فخر و غرور کے علاوہ آنحضور ﷺ سے عداوت و دشمنی کا اصل محرک رشک و حسد تھا، جس کا اظہار اس نے خود کیا۔ابن اسحاق نے مغیرہ بن شعبہ کی روایت بیان کی، مغیرہ نے کہا سب سے پہلا دن جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا وہ دن تھا جب میں اور ابو جہل مکہ کے گلی کوچوں میں پھر رہے تھے، ہماری ملاقات رسول اللہ ﷺ سے ہوئی، آپ نے ابو جہل سے فرمایا: اے ابو الحکم! میں تمہیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف آ جاؤ۔ابو جہل نے کہا: اے محمد! (ﷺ) کیا تم ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے رک جاؤ گے؟ کیا تم اس کے سوا کچھ اور بھی چاہتے ہو کہ ہم گواہی دیں کہ تم نے اپنا پیغام پہنچا دیا؟ پس ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم نے اپنا پیغام پہنچا دیا ہے۔ بخدا اگر میں یہ جان لیتا کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ برحق ہے میں پھر بھی تمہارا اتباع نہ کرتا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ چلے گئے۔پھر ابو جہل میری طرف متوجہ ہوا اور اس نے کہا: بخدا میں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ شخص جو کہتا ہے وہ برحق ہے لیکن بنی قصی نے کہا کہ حجابہ یعنی خانہ کعبہ کی دربانی ہمارے ذمے ہے، ہم نے اس کو تسلیم کر لیا۔انہوں نے کہا کہ ندوہ یعنی مجلس مشاورت کے ارکان ہم ہیں، ہم نے اسے بھی تسلیم کر لیا پھر انہوں نے بھی کھانے کھلائے اور ہم نے بھی کھانے کھلائے یہاں تک کہ جب ہمارے گھٹنے ان کے گھٹنوں سے ٹکرانے لگے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے، بخدا میں یہ کبھی نہیں مانوں گا (۱۱۷)۔یہ اعتراف ابو جہل کو بھی تھا اور دوسرے کفار کو بھی کہ محمد ﷺ سچے ہیں اور کسی معاملے میں جھوٹ کے مرتکب نہیں ہو سکتے، لیکن ہاں ان

کا پیغام انہیں بربنائے حسد قابل قبول نہیں۔ قرآن میں ان کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا:

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ O (۱۱۸)

اے محمد ﷺ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں

ابوجہل کی عداوت بغض وعناد میں اضافے کی ایک وجہ جس میں ضد اور ہٹ دھرمی بھی شامل ہو گئی، غالبًا یہ تھی کہ آغاز اسلام کے ساتھ ہی اس کے، اپنے گھر، اپنے رشتہ داروں، اپنے خاندان میں ایمان لانے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، اور ابوجہل کے نہ چاہنے کے باوجود اس کے اہل خاندان دامن مصطفوی سے برابر وابستہ ہوتے رہے۔ چنانچہ قدیم الاسلام کی مخزومی مسلمانوں میں سے ابوجہل کے عم زاد حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد، ان کی اہلیہ ام سلمہ، ان کے فرزند سلمہ رضی اللہ عنہم، ابوجہل کے ماں جائے بھائی عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ، اس کے ایک اور عم زاد ارقم بن ابی الارقم (جو ابوجہل کے درحقیقت ہم پلہ تھے بلکہ بعض لحاظ سے بہتر تھے اور جنہوں نے بلا خوف وخطر اپنا گھر، جو صفا سے متصل تھا، قیام نبوی ﷺ کے لئے پیش کیا اور ابتدائی مکی عہد میں وہی مرکز تبلیغ اسلام بنا رہا) ابوجہل کے حقیقی بھائی سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہ (جو ابوجہل کے ظلم وستم کا نشانہ بنے اور ہجرت حبشہ میں شریک ہوئے لیکن جب حبشہ سے لوٹ کر آئے تو دوبارہ ابوجہل کے نرغے میں آ گئے، اس نے انہیں قید کر دیا یہاں تک کہ ابوجہل کی موت کے بعد بھی جنگ خندق تک اسیر رہے)۔ بنو مخزوم کے متعدد گھرانوں میں اسلام بڑی تیز رفتاری سے پھیلا، اور جیسا کہ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ ابوجہل کی عداوت اسلام جتنی بڑھتی جاتی تھی اس کے خاندان کے حلفا اور موالی میں اسلام اتنی ہی تیزی سے پھیلتا چلا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت عمار رضی اللہ عنہ، ان کے والد یاسر رضی اللہ عنہ، ان کی والدہ سمیہ رضی اللہ عنہا (جو ابوجہل کی برچھی سے شہید ہوئیں، راہ اسلام کی پہلی شہیدہ) ان کے بھائی معتب بن عوف خزاعی رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ پھر ابوجہل کی موت کے بعد بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ فتح مکہ کے موقع پر مثلاً ابوجہل کے صاحبزادے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ، بہو اُم حکیم بنت حارث رضی اللہ عنہا، والدہ اسماء بنت مخرمہ داری بھی مشرف بہ اسلام ہو گئیں(۱۱۹)۔ یہ صورت حال ایسی تھی کہ جو دن بہ دن ابوجہل کے غصے کی آگ کو مسلسل بھڑکاتی رہی، اس کے سینے کی یہ آگ آنحضور ﷺ کے مدینہ منورہ ہجرت فرما

جانے کے بعد بھی شعلہ زن رہی، یہاں تک کہ ۲ ہجری میں جنگ بدر میں، جس کے وقوع میں ابوجہل کی ضد، ہٹ دھرمی اور اس کا فخر وغرور اصل تھا (۱۲۰) وہ بری طرح مارا گیا، اور دوسرے مقتولان کفار قریش کے ساتھ ایک کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔ (۱۲۱)

یہی المناک انجام بہت سے دوسرے دشمنان خدا ورسول (۱۲۲) کا، متکبرین، مکذبین، اشراف مکہ، متشددین قریش اور جملہ اعدائے اسلام کا ہوا، ان میں سے اکثر جن کا متذکرۃ الصدر فہرست میں ذکر ہوا جنگ بدر میں مارے گئے، یا بعد میں قتل ہوئے (۱۲۳)۔ کچھ شیاطین ومستہزئین اپنی موت آپ مر گئے (۱۲۴) اور جو باقی رہ گئے تھے وہ بالآخر فتح مکہ کے موقع پر اسلام کے سایہ عاطفت میں آگئے (۱۲۵) اور اس طرح ۸ ہجری میں عداوت ومخالفت قریش کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا۔

۹۔ متاثرین دعوت (سابقین اولین مع ضعفاء المسلمین) اور مخالفین دعوت (کفار ومشرکین) کے جائزے کے بعد اب اس بات پر نظر ڈال لینی چاہئے کہ وہ دعوت کیا تھی جس نے وہاں کے زمین وآسمان بدل دیئے تھے، جس نے متاثرین بھی پیدا کئے اور مخالفین بھی۔ اور اس دعوت کا داعی کیسا تھا، کون تھا جس کے خلاف اتنا طوفان برپا ہوا، متاثرین دعوت جن کو دیکھ کر جیتے تھے اور سارے عذاب والم سہتے تھے اور مخالفین دعوت جن کی جان کے پیچھے پڑے رہتے تھے اور داعی برحق ﷺ جو دعوت کے بارے میں اتنے پرعزم اور اس کی ترسیل وتبلیغ پر ایسے بے خوف کہ تاریخ نے ان کے یہ الفاظ محفوظ کر لئے ہیں:

واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی و القمر فی یساری علی ان اترک ھذا الامر حتی یظھرہ اللہ او اھلک فیہ ما ترکتہ (۱۲۶)

اگر یہ (کفار قریش) میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں کہ میں اپنا کام چھوڑ دوں، تو میں اس کام کو نہیں چھوڑوں گا، یہاں تک کہ اللہ اس دعوت کو ہی غالب فرما دے یا پھر اس کام میں میری جان ہی چلی جائے۔

داعی کا ظہور اور دعوت کا صدور ایک ساتھ ہوا۔ اس لئے داعی اور دعوت کا لازم وملزوم ہونا اور ایک دوسرے کے لئے جزو لاینفک قرار پانا واضح ہے۔ جو داعی تھا اور بہ تقاضائے منصب اجرائے دعوت پر مامور تھا دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ (۱۲۷) وہی رسول مکلف بہ تبلیغ تھا یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (۱۲۸) یہ فریضہ ان سے منفک نہ ہوسکتا تھا وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَہٗ (۱۲۹)، وہی خاتم

النبیین تھا (۱۳۰) کہ اس کی دعوت ہمیشہ کے لئے ہے، اور اس حیثیت میں داعی کا منصب دوام واستمرار سے متصف ہو جاتا ہے۔ اور وہی داعی شاہد، مبشر، نذیر بھی تھا (۱۳۱)۔ ان تمام حیثیات اور جامع پیغمبرانہ صفات کے ساتھ تمام انسانیت کی ہدایت اور اصلاح وفلاح کے لئے کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۱۳۲)۔ آنحضور ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ کی عمر چالیس برس ہو چکی تھی۔

یہ چالیس سالہ زندگی قبل از نبوت ورسالت وہیں عرب کے شہر مکہ میں جہاں جبل نور کی بلندیوں پر غار حراء واقع ہے، بسر ہوئی۔ آپ ﷺ کی ولادت مطہرہ، پرورش وپرداخت، اٹھان اسی ماحول اسی شہر مکہ میں ہوئی، بچپن، جوانی اور سن وسال کی تمام ترقی اس بلد امین میں، عام لوگوں کے درمیان، ان کے سامنے، صالح فطرت، پاکیزہ مشاغل، تعمیری اصلاحی کاموں کے ساتھ ہوئی۔ اس دوران آبادی کے تمام حلقوں میں بلکہ نزدیک و دور کے تمام علاقوں میں تعارف کا عنوان ''صادق وامین'' تھا۔ صدق وامانت، داعی کی لازم صفات ہیں۔ آپ ﷺ کے ہاں اس کے ساتھ خاندانی وجاہت، شرافت ونجابت، اخلاق وکردار کی صلابت، نیت وعمل کی طہارت بھی شامل تھی۔ حسب ونسب کی بزرگی، صورت وسیرت کا حسن اور سراپا کا نور سب ایک ہی ذات میں مجتمع تھا۔ ایک داعی، ایک نبی اور رسول کے لئے اس سے زیادہ صفات کا کمال ممکن نہیں (۱۳۳)۔ مختصر یہ کہ آپ ﷺ کی چالیس سالہ زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی، جس کے روشن حرف ہر ایک پڑھ سکتا تھا جس کی ہر سطر عمل کی سچائی سے مستحکم تھی، اور حاشیے میں گلوں کی خوشبو تھی۔ یہی بے داغ زندگی، یعنی اسوۂ حسنہ، مثالی کردار، اعلیٰ طرز حیات اور نمونۂ بشریت بجائے خود نبوت ورسالت محمدی کی پہلی شہادت، دلیل وبرہان قاطع تھی۔ اور اس قابل تھی کہ اعتبار واعتماد دعوت کے لئے پہلے اسے پیش کیا جائے۔ اس مضمون کا خلاصہ سورۂ یونس کے ایک چھوٹے سے جملے میں محفوظ کر دیا گیا: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۱۳۳/۱) ''پس میں نے (اس اظہار دعوت سے) پہلے تم لوگوں کے درمیان چالیس سالہ عمر گزاری ہے۔ کیا تم (اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے) نہ عقل رکھتے ہو کر سوچ سکو''۔

داعی اعظم ﷺ کی پیش کردہ دعوت بہت سادہ، آسان، توحید ورسالت پر مبنی محض ایک کلمے کی دعوت، اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ وَرُسُلِهٖ (۱۳۴) تھی۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ (۱۳۵) ''آپ ﷺ فرما دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے میں لوگوں کو توحید خدا کی طرف بلاتا ہوں'' یہ ایسا کوئی اجنبی، نیا طریقہ نہ تھا۔ تمام ماموران الٰہیہ نے اسی روش کو اپنایا، اسی کا آپ ﷺ کو حکم تھا: فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (۱۳۶) ''پس آپ ﷺ اسی (دین کی) طرف بلاتے رہیے جس طرح آپ ﷺ کو حکم ہوا ہے اور اسی پر

قائم رہئے" اللہ کی طرف دعوت ہی اصل دعوت تھی لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ (۱۳۷) آپ اسی کی دعوت پر مامور تھے وَادْعُ اِلٰی رَبِّکَ (۱۳۸) اَنَا اَدْعُوْکُمْ اِلَی الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ ○ (۱/۱۳۸) "میں تم کو (خدائے) غالب (اور) بخشنے والے کی طرف بلاتا ہوں"۔ دعوت الی اللہ بنیادی مگر نازک کام ہے، یہ داعی کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ حالات ومواقع، وقت ضرورت اور مصلحت کو پیشِ نظر رکھ کر دعوت کا وہ طریقہ کار اختیار کرے اور وہ مضمون و وہ پہلو اجاگر کرے جو مدعو کی ذہنی سطح، ان کی نفسیات وضروریات سے ہم آہنگ، اور قبولیت وآمادگی کا باعث ہو: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (۱۳۹) "اے پیغمبر ﷺ) آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت وموعظت کے ساتھ بلایئے اور ان کے سامنے احسن طریقے سے بحث ومباحثہ کیجئے"۔

آنحضرت ﷺ نے دعوت الی اللہ کے لئے کام کا آغاز خود اپنے گھر سے کیا اور پھر رفتہ رفتہ قریبی دوست احباب اور ایک دوسرے کے جاننے والے افراد دائرہ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے، جن کے لئے ہادیٔ اعظم ﷺ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے چند جملے ہی کافی تھے اور آپ کے آئینہ سیرت کے علاوہ کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہ تھی۔ زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تو اُسی روز ایمان لے آئیں جس دن آپ ﷺ غار حراء میں شرف نبوت ورسالت سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ دو دن بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ایمان لے آئے۔ ان سے آنحضور ﷺ نے اتنا ہی فرمایا تھا "میں تمہیں بھی ایک خدا پر ایمان لانے، اس کی عبادت کرنے اور لات وعزیٰ کا انکار کرنے کی دعوت دیتا ہوں"۔ (۱۴۰) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی آپ ﷺ کے اس فرمان پر دامن اقدس سے وابستہ ہونے میں ذرا سا بھی تردد نہیں کیا: "میں تمہیں بھی اللہ کی طرف سچائی کے ساتھ دعوت دیتا ہوں بخدا یہ دعوت برحق ہے تم ایک خدا کو مانو جس کا کوئی شریک نہیں" (۱۴۱)۔ حضرت ابوذر اور ان کے دوساتھی اس استفسار کے بعد کہ آپ ﷺ کیا کہتے ہیں اور آپ کی دعوت کیا ہے؟ آپ کے قول پر ایمان لے آئے کہ میں کہتا ہوں کہ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس کا رسول ہوں"۔ (۱۴۲)

اس طرح انفرادی طور پر دعوت وتبلیغ کے اس پہلے مرحلے میں اسلام کا تعارف روز بروز وسعت اختیار کرتا چلا گیا، اور چند سادہ جملوں، آسان مضمون، دوٹوک گفتگو، اور پرخلوص دعوت وتحریک کی بنا پر اہل ایمان کی تعداد بڑھتی رہی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کفار ومشرکین قریش اور اشراف مکہ کی سمجھ میں یہ بات آتی چلی گئی کہ آنحضرت ﷺ اور ان کے دوست احباب، اپنے آباؤ واجداد کے طور طریق کو چھوڑ کر نیا دین نئی بات

پیدا کررہے ہیں، جس سے ان کے جاہلی معاشرے پر بہت برے اثرات پڑ رہے ہیں۔ اور یہ تشویش کی بات ہے۔

ابلاغ حق اور اجرائے تبلیغ کا دوسرا مرحلہ اس وقت آیا جب کہ آنحضرت ﷺ کو حکم ربانی ہوا کہ: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۱۴۳) ''اپنے (قریبی) عزیزوں، رشتہ داروں کو ڈرائیے'' ابلاغ حق اور تبلیغ رسالت کا ایک لازمہ انذار (۱۴۴) کسی خوفناک انجام سے متنبہ کرنا، اس کی ہولناکی سے آگاہ کرنا اور ڈرانا، اور اس کے مقابل تبشیر کسی اچھی بات، اچھے انجام و انعام کی خوشخبری سنانا ہے۔ اس لئے ہر رسول نذیر یا منذر (ڈرانے والا) اور بشیر و مبشر (خوشخبری سنانے والا) بھی ہوتا ہے (۱۴۵)۔ حضور خاتم النبیین ﷺ بھی حق رسالت ادا کرتے ہوئے انذار و تبشیر سے کام لیتے رہے۔ بالکل ابتدا میں ہی حکم مل گیا تھا قُمْ فَاَنْذِرْ (۱/۱۴۵) اٹھ کھڑے ہوئیے اور (لوگوں کو) آگاہ کیجئے (ڈرائیے) آپ ﷺ کی منصبی حیثیت بھی یہی تھی وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (۱۴۶) چنانچہ تعمیل حکم کے اس مرحلے میں آنحضرت ﷺ بطور خاص اپنے رشتہ داروں کو دعوت الی اللہ اور انذار من الآخرۃ پر متنبہ کرنے کے لئے، ان کی بار بار دعوتیں کرتے رہے (۱۴۷) اور انفرادی اور اجتماعی طور پر، شرک کو ترک کرکے تو حید اختیار کرنے اور انجام دنیا اور فکر آخرت کے لئے خبردار فرماتے رہے۔ صحاح ستہ اور تاریخ و سیر کے مآخذ میں سورۂ شعراء کی محولہ بالا آیت کا حوالہ دے کر اکثر و بیشتر یہ بیان کیا گیا ہے کہ قریش کے خاص و عام کو جمع کرکے کوہ صفا پر جلوہ افروز ہو کر حضور ﷺ نے جو خطاب عام فرمایا تھا، اور جو انذار آخرت کے صرف ایک ہی جملہ پر مشتمل تھا اور جسے سن کر ابولہب لعنۃ اللہ نے آپ ﷺ کے لئے بدگوئی سے کام لیا تھا، وہ دراصل اسی حکم ربانی وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کی متابعت میں تھا۔ (۱۴۸) لیکن مکی جاہلی معاشرے کی صورت حال اور ترتیب دعوت نبوی کے لحاظ سے یہ نکتہ ہمارے نزدیک مزید غور و فکر کا متقاضی ہے، اور کتب حدیث و سیرت میں جو روایات منقول ہیں ان کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ میں الفاظ، معنی اور مضمون کا انطباق بہ اعتبار تخاطب قریبی رشتہ داروں، اقربا، خاندان والوں تک ہی محدود تھا۔ جن سے خطاب عام کا وجوب مترشح نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ اگر بخاری میں حضرت ابن عباس کے اس قول کا اعتبار کیا جائے کہ قریش کے جتنے خاندان مکہ مکرمہ اور اس کے اطراف میں آباد تھے ان میں سے کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس سے آپ کا کسی نہ کسی طرح کی رشتہ داری کا تعلق نہ ہو تو اس دائرے میں تمام قریش شامل ہو جاتے ہیں اور تخاطب خاص (برائے اقربین) خطاب عام (بر کوہ صفا) قرار پا سکتا ہے۔ (۱۴۹)

اسی سلسلے میں یہاں ابن اسحاق کا یہ بیان قابل ذکر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بعثت کے

بعد ابتدائی تین سال تک خفیہ طریقہ سے تبلیغ کرتے رہے، اس کے بعد علانیہ دعوت کے لئے اللہ نے آپ ﷺ کو یہ احکام دیئے، ۱۔فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ O (۱/۱۴۹) ''پس اے نبی! علانیہ کہہ دیجئے جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے'' ۲۔وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ O (۲/۱۴۹) ''اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈرایئے اور جو اہل ایمان آپ کے متبع بن گئے ہیں ان سے تواضع سے پیش آیئے'' ۳۔وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ O (۳/۱۴۹) ''اور آپ فرما دیجئے کہ میں تو علانیہ ڈرانے والا ہوں'' ابن اسحاق نے اس بیان کے فوراً بعد عبداللہ بن حارث اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے جس میں سورۂ شعراء کی مذکورہ آیت کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ کے حکم سے اہل قرابت کے لئے دعوتوں کا انتظام اور ان میں آپ ﷺ کے خطاب کی تفصیلات درج ہیں (۱۵۰) جس سے یہ قرینہ نکلتا ہے کہ سورۂ شعراء کی آیت کی متابعت میں آنحضور ﷺ نے اپنے عزیزوں، قرابت داروں کو مخاطب فرمایا تھا۔

یعقوبی نے النذارہ کے زیر عنوان حکم الٰہی وانذر عشیرتک الاقربین کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے مروہ پر کھڑے ہو کر جن خاندانوں کو بہ آواز بلند پکارا، ان میں آل فہر، آل لوئی، آل کعب، آل مرہ، آل کلاب، آل قصیٰ، آل عبدمناف، اور آل ہاشم تھے، اور پھر لکھا ہے کہ روایت کے مطابق وہ دارالحارث بن عبدالمطلب میں جمع ہوئے اور وہ سب ملا کر ۴۰ یا اس سے کچھ کم یا زیادہ تھے (۱۵۱)۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے مختلف مواقع پر قوم سے خطاب فرمایا مثلاً مسلم کی ایک حدیث (۱/۱۵۱) کے مطابق جب سورۃ الشعراء کی مذکورہ آیت کا نزول ہوا تو نبی کریم ﷺ پہاڑی کی ایک چٹان کے پاس تشریف لے گئے اور سب سے اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر پکارا: اے عبدمناف کی اولاد میں تم کو متنبہ کرنے والا ہوں۔ میری اور تمہاری مثال اس شخص کی سی ہے جو دشمن کو دیکھ کر اپنے اہل وعیال کو بچانے کے لئے چل پڑے اور اس اندیشہ کے پیش نظر کہ مبادا دشمن پہلے نہ پہنچ جائے وہ یا صباحاہ کی صدا لگائے۔ اس میں نہ تو کوہ صفا کا حوالہ ہے اور نہ عبدمناف کی اولاد کے علاوہ دوسرے خاندان کا ذکر ہے۔ بہر حال احادیث و سیر کی تمام روایات کے پیش نظر یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ انفرادی طور پر تبلیغ دعوت قم فانذر کے بعد خاندان والوں کو علانیہ مخاطب کرنے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اور پھر بانگ دہل تمام قریش سے تخاطب عام فاصدع بما تومر کے مراحل یکے بعد دیگرے بہت کم عرصے میں طے ہو گئے۔ بنابریں خاندان قریش کے تمام بطون کو نام بہ نام پکارنے کے بعد اور قبیلہ در قبیلہ مدعو کرنے کے بعد (۱۵۲) یعنی اہل قرابت کو متنبہ

jo\Alsera

کرنے کے ساتھ ساتھ عوام الناس کے لئے مخاطبت کے بھی گویا تمام تقاضے پورے ہو گئے تھے، تاہم حجت تمام کرنے کے لئے کوہ صفا پر تشریف لے جانے کے بعد پورا زور لگا کر قوم کو پکارنا اور تمام عام و خاص کا اس بڑے پیمانے پر جمع ہونا کہ جو آدمی خود نہ آسکتا تھا اس نے اپنا نمائندہ بھیج دیا تھا، آپ ﷺ نے اس طرح اپنے اعلیٰ کردار اور صدق مقال کی شہادت لے کر النذیر المبین کی حیثیت سے حق نصیحت ادا فرما دیا اور اپنے بارے میں یا پیغام و دعوت کے بارے میں ذرہ برابر بھی غلط فہمی یا اخفا و اشتباہ باقی نہ رہنے دیا۔

مختصر یہ کہ ابتدائی تین سالہ عرصے میں ہی یعنی عطائے نبوت اور اجرائے رسالت سے لے کر کوہ صفا سے مخاطبت عام اور حجت اتمام تک، کا زمانہ تبلیغی و دعوتی سرگرمیوں سے اتنا بھرپور رہا کہ مکہ اور اس کے مضافات میں ہی نہیں بلکہ سرزمین عرب میں دعوت محمدی کا چرچا ہو گیا۔ اور چھوٹا بڑا، عورت مرد، ادنیٰ اعلیٰ، وخاص عام، مالک غلام سب نے جان لیا کہ سید الرسل ہاشمی و مطلبی، آبائے جاہلیت اور اجداد ماقبل کے عقائد و مذہب سے مختلف، ایک نئے دین اور الہامی مذہب کی دعوت دے رہے ہیں۔ النذیر العریاں، عرب کلچر میں خاص مقام رکھتا تھا، اس کی پکار ایمرجنسی ڈیکلیر کر دیتی تھی اور پوری بستی بلا تامل اس کی اطلاع کو قبول، اس کی دہائی پر متوجہ اور اس کے اعلان کے مطابق متحرک ہو جاتی تھی۔ حضور ﷺ نے بھی النذیر المبین کی حیثیت سے کوہ صفا پر چڑھ کر پکارا تو مکہ مکرمہ کی پوری بستی امڈ آئی، اور بیک وقت سب مطلع ہو گئے کہ قوم کا غم خوار آقا، وقت سے پہلے قوم کو نفع نقصان سے خبردار کر رہا تھا۔ آپ ﷺ کے مختصر خطاب کے بعد قوم کو منتشر ہونا ہی تھا۔ ابولہب کا نفرت انگیز جملہ تو خود اس کے عبرت ناک انجام تک پہنچانے کا باعث بنا۔ تاریخ اور روایات سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ خطاب رسالت مآب ﷺ کے لاتعداد مخاطبین میں سے کسی اور نے انکار و استرداد سے کام لیا ہو۔ اس وقت تو مقصد رسول قوم کو متنبہ کرنا، اور اپنی بات کھول کر بیان کر دینا تھا۔ یہ کب توقع کی گئی تھی کہ آپ ﷺ ایک جملہ ادا فرمائیں گے اور پورا مجمع بیعت کے لئے دوڑ پڑے گا؟

اپنے ہم وطنوں اور ابنائے قوم کو علی الاعلان متنبہ کرنے کے بعد، دعوت توحید اور انذار آخرت کے کام میں ظاہر ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ذرہ برابر بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ آپ ﷺ پوری تندہی سے لگ گئے، میدان، گلیاں، بازار، مکانات، مضافات جہاں جہاں بھی آپ پہنچ سکتے تھے، دعوت حق سنانے اور سعید روحوں کو تلاش کرنے کے لئے تشریف لے جاتے، آپ ﷺ کی خاص توجہ کا مرکز ومحور حرم کعبہ تھا، جو اہل مکہ کا مرکز ثقافت، معبد اور محل اجتماع تھا۔ اشراف کی چوپال یہیں جمتی، بات چیت، قصے کہانیاں، ہنسی مذاق، مہمانوں، مسافروں کی آمد و رفت، سرداروں کی نشست و برخاست، ان کا رعب

داب، طاقت کے مظاہرے، عطا و بخشش، سزا و سرزنش کا موقع و محل یہی تھا۔ زائرین کی سرگرمیاں، حجر اسود کی تعظیم، طواف بیت اللہ، بتوں سے استمداد، ان کی عبادت، ان سے راز و نیاز، چڑھاوے، قربانیاں، فال گیری وہاں کے معمولات تھے۔ آنحضور ﷺ اکثر و بیشتر وہاں جلوہ افروز ہوتے، حجر اسود کا استلام فرماتے ہوئے خانہ کعبہ کا طواف فرماتے، حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان کھڑے ہو کر نماز ادا فرماتے، آپ کا رخ بیک وقت خانہ کعبہ اور بیت المقدس کی طرف ہوتا۔ لوگوں سے میل ملاقات فرماتے، دعوت الی اللہ کی طرف رجوع فرماتے، (۱۵۳) لوگوں کی غلط فہمیاں، اعتراضات رفع فرماتے اور حسب ضرورت قرآن سنا کر ان کی ہر بات کا جواب عطا فرما دیتے (۱۵۴)۔ اور راہ حق کی طرف پلٹنے کی امید رکھتے۔

دعوت نبوی اور مخالفت قریش دونوں میں توسیع و ترقی انہی احوال و ظروف میں ہوئی۔ ایمان لانے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ دار ارقم میں ایک مرکز بھی قائم ہو گیا۔ معاشرے کے سربر آوردہ حضرات حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو اہل ایمان کو تقویت ملی اور دعوت نبوی کی شان اور بڑھ گئی۔ حضرت حمزہ کے ایمان لانے کے بعد ابن ہشام نے لکھا تھا: **فلما اسلم حمزة عرفت قریش ان رسول الله ﷺ قد عز و امتنع، و ان سیمنعه فکفوا عن بعض ما کانوا ینالون منه** (۱۵۵) اور کچھ ہی عرصے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے پر تو گویا کہ جاہلی معاشرے میں دھماکہ ہو گیا۔ پورا اشرافیہ حیران و پریشان، بڑے بڑے سردار مضطرب، کفار قریش تلملا کر رہ گئے۔ آج یہ مسلمان ہو گیا کل کو وہ ایمان لے آیا، اور اب عمر ابن خطاب جیسا حربی و بے باک بھی اعلان کر کے نبی عربی و ہاشمی و مطلبی کا ہم نوا بن گیا ہے، اور اب تو حرم کعبہ میں ان سب کا آنا جانا، بیٹھنا اٹھنا بھی دھڑلے سے شروع ہو گیا۔ یہ خبریں، یہ واقعات کفار و مشرکین کے لئے سخت پریشان کن، بڑے خطرے کی علامت اور حد برداشت سے باہر تھے۔ چنانچہ بقول ابن سعد جب قریش نے دیکھا کہ اسلام کا غلبہ روز افزوں ہے اور مسلمان خانہ کعبہ کے اردگرد بیٹھنا شروع ہو گئے ہیں تو سخت بوکھلا گئے اور اٹھ کر ابو طالب کی طرف چل کھڑے ہوئے (۱۵۶)۔ روایت بہت طویل ہے لیکن اس کا مرکزی حصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے بارے میں قریش کے شکوہ شکایت اور فرمائش پر جناب ابو طالب نے آنحضور ﷺ کو بلا بھیجا اور کہا کہ **یا ابن اخی هؤلاء عمومتک واشراف قومک وقد ارادوا ان ینصفونک** اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کہو میں سن رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تم ہمیں اور ہمارے معبودوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو، ہم تمہیں اور تمہارے الٰہ کو تمہارے حال پر چھوڑتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے جواباً فرمایا دیکھو! اگر میں تمہیں ایک ایسا کلمہ پیش کروں

Alsera

کہ اگر تم اس کا اقرار کر لو تو سارے عرب کے تم فرمانروا بن جاؤ گے اور تمام عجم تمہارے زیر نگین ہو جائے گا (۱۵۷)۔ اس پر ابو جہل بولا یہ تو بہت نفع بخش اور سود مند بات ہے ہم اسے ضرور مان لیں گے بلکہ ایسی دس باتیں اور بھی ہوں تو انہیں بھی تسلیم کر لینے میں ہمیں عار نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا **قولوا لا الٰہ الا اللہ** ''تو پھر لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لو'' یہ سن کر وہ لوگ غیظ و غضب کے عالم میں اپنے کپڑے سمیٹتے، پیر پٹختے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے چلائے کہ **اصبروا علیٰ الھتکم ان ھذالشی یراد** ''اپنے اپنے معبودوں (کی عبادت) پر ڈٹے رہو' بلاشبہ یہ (کہ الٰہ ایک ہے) ایسی بات ہے جس کا کچھ اور ہی مقصد ہے۔'' (۱۵۸)

کفار و مشرکین متعدد بار جناب ابو طالب کے پاس آئے، حضور ﷺ کی تبلیغ و دعوت کے نتیجے میں مکی معاشرت میں پیدا ہونے والے اثرات و نتائج، الزامات، احتجاج سے مطلع کیا اور بھتیجے کی مبلغانہ سرگرمیوں کو خطرات سے بھر پور قرار دیا۔ جناب ابو طالب بھی چوکنا ہو گئے اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ قریش آئندہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لئے بھتیجے کی حفاظت و نگرانی کے لئے وہ مزید فکر و تشویش میں مبتلا ہو گئے (۱۵۹)۔ ادھر کفار و مشرکین مکہ اور سرداران قریش اپنے عزائم، ارادوں اور مقاصد کے مطابق نتائج نہ نکلنے اور مسلسل ناکامیوں پر خود حیران و پریشان تھے۔ ان کی سب تدبیریں الٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے اہل ایمان کی ایک بڑی تعداد دو مرتبہ حبشہ ہجرت کر گئی، قریش نہ انہیں جانے سے روک سکے نہ حبشہ سے واپس لا سکے۔ نیز یہاں مکہ میں مسلمانوں پر انفرادی تشدد، بے رحمانہ سلوک اور چھ سال میں طرح طرح کے مظالم خاطر خواہ نتائج پیدا نہ کر سکے وہ جھنجھلا کر رہ گئے۔

اس صورت حالات میں داعیٔ اعظم ﷺ نے اپنے معمولات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی اور آپ ﷺ حسب سابق فرائض تبلیغ میں مستعد، دعوت حق کے کاموں میں منہمک اور پوری سنجیدگی، بے خوفی، استقلال و پامردی سے اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ ہمیشہ کی طرح اکثر و بیشتر حرم کعبہ میں تشریف فرما ہوتے۔ اور کفار و مشرکین، سرداران قریش اور زائرین کی موجودگی میں طواف، قیام و قعود، ذکر و دعا میں مشغول رہتے۔ ناموافق حالات کے باوجود آپ ﷺ نہ ڈرے، نہ سہمے نہ لوگوں سے مخاطبت ترک فرمائی، نہ نام نہاد اشراف قوم سے مرعوب ہوئے، بلکہ بعض اوقات تو معاملہ الٹ ہو جاتا تھا۔ اصحاب سیر نے لکھا کہ اراش کا ایک شخص مسجد حرام میں آ کر فریاد کناں ہوا کہ اے گروہ قریش کون شخص ابو الحکم (ابو جہل) سے مجھے میری رقم دلوائے گا۔ میں غریب الوطن مسافر ہوں وہاں موجود معاندین نے ازراہِ تمسخر آنحضور ﷺ کی

طرف اشارہ کردیا کہ وہ شخص دلوائے گا، وہ اراشی آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہوا اور ابو جہل سے رقم دلوانے کی درخواست کی جو اس نے اونٹ خرید کر اسے نہیں دی تھی۔ آپ ﷺ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر ابو جہل کے مکان پر پہنچے، دروازہ کھٹکھٹا کر ابو جہل کے باہر آنے پر اس سے فرمایا کہ اس شخص کا حق ادا کردو، ابو جہل کا رنگ فق ہوگیا تھا، وہ بلا چوں چرا اندر گیا اور اس اراشی کی پوری واجب الادا رقم لا کر دے دی، وہ اراشی خوش ہو کر دعائیں دیتا چلا گیا اور ابو جہل کی مرعوبیت کا سب کو تماشا دکھا گیا۔(۱۶۰)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت کے مطابق ایک دن قریش کے سردار حجر میں جمع ہو کر آپس میں آنحضور کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے جتنا صبر ان کی دعوت کے حوالے سے کیا ہے ویسا کسی معاملے میں کبھی نہیں کیا تھا وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ بھی تشریف لائے اور حجرِ اسود کو بوسہ دے کر طواف کعبہ میں مشغول ہوگئے۔ پہلے چکر میں جب آپ ﷺ ان سرداروں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کرکے کچھ باتیں کیں، آپ نے نظر انداز فرمادیا، دوسرے چکر میں بھی ایسا ہی ہوا لیکن تیسرے چکر میں چلتے ہوئے سرداروں کی حرکت پر ان کے پاس ٹھہر گئے اور فرمایا: اے گروہ قریش! کیا تم سنتے ہو؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں تو تم لوگوں کو ذبح کرنے کے لئے آیا ہوں۔ راوی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اس کلمے کی ہیبت ساری قوم پر طاری ہوگئی اور ان میں سے ہر شخص دم بخود ہوگیا، جیسے اس کے سر پر پرندہ ہو۔ وہ اس حد تک ہیبت زدہ تھے کہ ان میں سے سخت ترین افراد جو قبل ازیں لوگوں کو بھڑکاتے تھے چکنی چپڑی باتیں کرنے لگے اور یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ ابو القاسم! آپ بھلائی اور برکت کے ساتھ تشریف لے جائیے، بخدا آپ نے کبھی ایسی سخت باتیں نہ کی تھیں، اس کے بعد آپ ﷺ واپس چلے گئے۔(۱۶۱)

حالات کی سنگینی دیکھئے اور نبی عربی ﷺ کا جگر گردہ دیکھئے کہ دوسرے دن آپ پھر حرم جا پہنچتے ہیں۔ قریش یکایک آپ کی طرف جھپٹ پڑے اور گھیراؤ کرکے کہنے لگے تم وہی ہو جو ایسا ایسا کہتے ہو، یعنی ہمارے معبودوں اور ہمارے دین کی عیب جوئی کرتے ہو، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں وہی ہوں جس نے ایسا کہا ہے۔ راوی کے مطابق ایک شخص نے آپ ﷺ کو پوری چادر سمیت پکڑ لیا، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دوڑے ہوئے آئے اور آپ ﷺ کو چھڑایا اور کہنے لگے تمہارا ستیاناس! کیا تم اس شخص کے قتل کے درپے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ پھر لوگ آپ ﷺ کے پاس سے ہٹ گئے۔ یہ واقعہ ان تمام ظالمانہ کارروائیوں میں سے زیادہ سخت تھا جو قریش نے آپ ﷺ کے ساتھ روا رکھا اور قریش کی بدسلوکی

کی نمایاں مثال۔(۱۶۲)

وقت تیزی سے گزر رہا تھا، کفار و مشرکین مکہ اور مخالفین و معاندین قریش اپنی چھ سالہ بھرپور کوششوں کے باوجود ناکام و نامراد تھے، جب کہ مسلمانوں کی پیش قدمی جاری تھی، آنحضور ﷺ کی بے خوف وخطر مبلغانہ سرگرمیاں اور جناب ابو طالب کی اعلانیہ حمایت و طرفداری، نیز بنو ہاشم اور بنو مطلب کی طرف سے تعاون، حالانکہ وہ اپنے آبائی دین پر ہی قائم تھے۔ ان حالات میں محرم ۷ نبوی میں قریش نے برافروختہ ہوکر یہ طے کیا کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف ایک دستاویز لکھی جائے کہ ان کے ساتھ شادی بیاہ اور خرید و فروخت کے تعلقات نہ رکھے جائیں۔(۱۶۳) ابن سید الناس نے اس معاشی و معاشرتی مقاطعے کی نوعیت کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے: **اجمعوا علی ان لا یبایعوهم، و لا یدخلوا الیهم شیئاً من الرفق، و قطعوا عنهم الاسواق، وان لا یترکوا طعاماً، ولا اداماً ولا بیعاً الا بادروا الیه و اشتروه دونهم، ولا ینا کحوهم ولا یقبلوا منهم صلحاً ابداً، ولا تاخذهم بهم رافة حتی یسلموا رسول الله ﷺ للقتل، وکتبوا بذلک صحیفة وعلقوها فی الکعبة۔**(۱۶۴)

یہاں اس دستاویز کے متن و مندرجات اور نتائج و اثرات پر مفصل گفتگو کا تو موقع نہیں ہے (۱۶۵) لیکن دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ اس دستاویز کے مطابق بنو ہاشم و بنو مطلب کا معاشی اور معاشرتی مقاطعہ غیر معینہ مدت کے لئے کیا گیا تھا، اگرچہ یہ مختلف وجوہ سے صرف تین سال تک (۷ تا ۱۰ نبوی) ہی کارآمد رہا۔ دوسرے یہ کہ سرداران قریش کی طرف سے یہ ظالمانہ سفاکانہ کارروائی اور اجتماعی زیادتی کا یہ طریقہ بنو ہاشم، بنو مطلب، اور ابو طالب پر دباؤ ڈالنے کے لئے تھا، اور مقصود اصلی یہ تھا کہ خاندان، قبیلے والے شدائد سے عاجز آکر خود ہی آنحضرت ﷺ کو قریش کے حوالے کر دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

داعی اعظم ﷺ کے خلاف قریش کا یہ سازشی منصوبہ بالآخر ناکام و نامراد ٹھہرا۔ انہوں نے اپنا ہدف حاصل کرنے کے لئے بنو ہاشم و بنو مطلب کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ ان خاندانوں میں اکثریت آبائی دین کے پیروکاروں کی تھی، اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ نئے دین کے علمبردار کے لئے انہیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی، نیز قوم سے تنہائی اور معاشی مشکلات، ان کو بالآخر مجبور کر دیں گی کہ وہ دست کش ہو جائیں اور ان کے مطالبے کے مطابق آنحضور ﷺ کو حوالے کر دیں گے۔ قریش کا یہ اندازہ درست نہ نکلا، بنو ہاشم اور بنو مطلب دونوں کو محمد بن عبداللہ (ﷺ) سے بے پناہ محبت تھی، آپ کی خاطر وہ سب کچھ کر گزرنے اور ہر قربانی کے لئے تیار اور ہر آزمائش کے لئے آمادہ تھے۔ اس موقع پر ابن اسحاق نے حضرت صفیہ بنت

عبدالمطلب اور جناب ابو طالب کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان سے نہ صرف اصل حقائق کی وضاحت ہوتی ہے بلکہ ان خاندانوں کی پامردی و جواں مردی، صبر و ثبات، بہادری و اولوالعزمی ثابت ہوتی ہے۔(۱۶۶)

جناب ابو طالب کے لاتعداد اشعار میں سے چند مخصوص اشعار کا ترجمہ ان کے عزم و استقلال کو، آنحضور ﷺ سے ان کی بے پناہ محبت، اور اپنے موقف کی سچائی کو بخوبی ثابت کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔ بخدا قریش اپنی جمعیت کے باوجود (آنحضرت ﷺ کو نقصان پہنچانے کے لئے) آپ کے قریب ہرگز نہیں پہنچ سکیں گے، جب تک کہ میں مٹی میں دفن نہ ہو جاؤں، آپ ﷺ اپنا کام جاری رکھیں، ذلت و منقصت آپ ﷺ کو چھو نہ سکے گی۔ آپ خوش ہو جائیں اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا رکھیں۔ آگے چل کر کہا۔ میں ان کے سامنے چٹان کی طرح ڈٹ گیا اور میرے پاس ایک لچک دار کمان اور معاہد کی تلواروں میں سے ایک تلوار تھی، ایک جگہ کہتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہم نے محمد (ﷺ) کو موسیٰ جیسا نبی پایا ہے جن کا ذکر پہلی کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے۔ جو کچھ تم نے اپنی دستاویز میں قلمبند کیا ہے، اونٹنی کے نوزائیدہ بچے کی آواز کی طرح اس کی نحوست کا وبال تمہیں پر پڑے گا۔ نیند سے بیدار ہو جاؤ اور ہوش میں آؤ قبل اس کے کہ قبر کھودی جائے اور جس نے کوئی گناہ نہیں کیا اس کو بھی گنہگاروں کی طرح حساب دینا پڑے۔ جنگ کو دعوت نہ دو اور زور آزمائی کے مواقع پے درپے پیدا نہ کرو، کیونکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جنگ کا دودھ جس شخص نے بھی چکھا ہے اس نے اسے کڑوا ہی محسوس کیا ہے۔ رب البیت کی قسم ہم وہ لوگ نہیں ہیں کہ شدائد زمانہ اور کرب و بلا کی وجہ سے احمد ﷺ کو حالات کے سپرد کریں۔ کیا ہمارے باپ ہاشم نے اپنی قوت کو مستحکم نہیں کیا تھا اور اپنے بیٹوں کو یہ وصیت نہیں کی تھی کہ وہ نیزے اور تلوار کے استعمال میں مہارت پیدا کریں۔ ہم جنگ آزمائی سے اکتانے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ خود جنگ ہی ہم سے اکتا جائے۔ اور ہم پر جو نکبت و مصیبت بھی آئے ہم اس کے بارے میں شکایت کرنے والے نہیں ہیں۔(۱۶۷) پھر آگے شجاعت و عزیمت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم محمد (ﷺ) کے قتل کو گوارا کرلیں اور نیزوں کے سروں کو اور حجاز، نجد، تہامہ کی سرزمین کو خون سے رنگین نہ کریں۔ وہ ہم سے ایسا نامعقول مطالبہ کر رہے ہیں جس کو حاصل کرنے کے لئے نیزوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور سیدھا رکھنے والی تلواروں کی ضربیں کھانا پڑتی ہیں۔ بیت اللہ کی قسم! تم جھوٹے ہو تم آنحضرت ﷺ کو قتل نہیں کر سکو گے، یقیناً سروں کی کھوپڑیاں حطیم اور زمزم کے پاس کاٹ کر پھینکی جائیں گی، خونی رشتے منقطع ہو جائیں گے، مصاہرت اور دوستی اور ہمسائیگی کے تعلقات فراموش کر دیئے جائیں گے اور حرم کعبہ میں آنے والے ہر شخص کو پردہ پوش کر دیا جائے گا۔(۱۶۸)

Alsera

حالات کی اس تنگی میں بھی حضور اکرم ﷺ کی تبلیغی مساعی جاری و ساری رہیں۔ قریش کی طرف سے پیدا کردہ مشکلات، معاشی و معاشرتی مقاطعے میں اشیائے خورد و نوش کی مسلسل قلت اور قوم کی بے رخی نے دشواریاں تو بہت پیدا کردیں، لیکن کسی کے ثبات و استقلال میں کمی نہیں آئی۔ نہ خاندان والوں نے پست ہمتی دکھائی اور نہ آنحضور ﷺ کی دعوتی سرگرمیاں معطل ہوئیں (۱۶۹) قریش کی طرف سے معاشی و معاشرتی مقاطعے کے ظالمانہ شب و روز مسلسل تین سال تک جاری رہے۔ جس سال (۱۰ نبوی) یہ ظالمانہ مقاطعہ ختم ہوا، اس سال حضور اکرم ﷺ کو پے در پے صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال پر ملال، جناب ابو طالب کی وفات، آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کی رحلت (۱۷۰)۔ ذاتی اور دعوتی حوالوں سے یہ بڑے نقصانات تھے۔ چنانچہ یہ سال ۱۰ نبوی عام الحزن یعنی غم و اندوہ کا سال قرار پایا۔ اس میں اگر (شوال ۱۰ نبوی) طائف کا تبلیغی سفر بھی شامل کرلیا جائے (۱۷۱) جب کہ اشراف و سادات ثقیف نے آپ ﷺ کی دعوت اسلام کا مثبت جواب نہیں دیا، بلکہ غنڈوں اوباشوں کو پیچھے لگا کر آپ ﷺ کو لہولہان کرایا گیا، تو پھر طائف میں سرداران بنو ثقیف کا منفی گستاخانہ رویہ اور وقتی ناکامیابی آپ ﷺ کے حزن و ملال میں مزید اضافے کا باعث ہوئی۔ (۱۷۲) تاہم بحیثیت داعی حق سخت ترین حالات میں صبر و استقامت کا اعلیٰ ترین مظاہرہ، مصائب و آلام اور آزمائش میں بھی ثبات و استقلال، رجوع الی اللہ، تسلیم و رضا کی فراوانی اور مایوسی اور بددلی کی بجائے بیم و رجا، نیز یقین و اعتماد کے ساتھ مستقبل کے بارے میں انتہائی پر عزم رویہ آئندہ کی بلندیوں اور کامیابیوں کی ضمانت تھا۔ (۱۷۳) چنانچہ بعد کے واقعات سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ طائف میں رنج و الم اور حزن و ملال کی اس منزل تک پہنچنے کے فوراً بعد ہی دینی و دنیوی عروج و ترقی کے مراحل یکے بعد دیگرے آتے چلے گئے۔ یعنی بظاہر پستی و اضمحلال کے بعد عروج و صعود کا پیش آنا گویا بالکل منطقی امر تھا، چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے مطابق اس کی توجیہ یہ ہے کہ "ہر منفی قانون کی انتہا مثبت پر ہوتی ہے، نیز ہر عمل کی تان ردعمل پر ٹوٹتی ہے" (۱۷۴)، (لہٰذا) صفا کے دامن سے جس انکار (دعوت) کی ابتدا ہوئی تھی طائف کی اس گھاٹی میں اس (انکار و استرداد) کی انتہا ہوگئی (۱۷۵)۔ اس کے بعد اثبات و موافقت کا مرحلہ آنا ناگزیر تھا اور عمل کی آخری حد کے بعد ردعمل کا آغاز ہونا تھا۔ یعنی تنزل و انحطاط کے بعد استقلال و استحکام اور عروج و صعود کی جانب سفر کا آغاز ہونا گویا یقینی تھا۔ چنانچہ اس کے مناظر و مدارج یکے بعد دیگرے سامنے آتے چلے گئے۔ اس کی کچھ تفصیل اور اشارات درج ذیل ہیں:

Alsera

۱۔آنحضرت ﷺ طائف سے واپسی سفر میں ابھی قرن المنازل (یا قرن الثعلب) تک ہی پہنچے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام ملک الجبال کے ہمراہ خدمت نبوی ﷺ میں آئے اور فرمایا کہ آپ کی قوم (بنو ثقیف) نے جو کچھ آپ ﷺ کو جواب دیا ہے اللہ نے اسے سن لیا ہے اب یہ پہاڑوں کا منتظم فرشتہ (ملک الجبال) اللہ نے بھیجا ہے آپ ﷺ جو حکم دینا چاہیں اسے دے سکتے ہیں ۔یعنی بقول مولانا گیلانی ”جسے پتھر کے ٹکڑوں سے پتھرایا گیا تھا اس کو اختیار دیا گیا کہ وہ پہاڑوں سے اس کا جواب دے سکتا ہے ۔(۱۷۶)اس اختیار کلی کہ فرشتہ مطیع وفرمانبردار کہ حکم ملنے پر پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دے تو درمیانی پوری آبادی تہس نہس ہو جائے کے باوجود رحمت عالم ﷺ عالی ظرفی کے ساتھ طائف کے منکروں اور متکبروں کے لئے ابر کرم بن جاتے ہیں، اور یہ الفاظ ادا فرما کر عفوو درگزر کے دریا بہا دیتے ہیں کہ ”میں مایوس نہیں ہوں کہ ان کی پشت سے ایسی نسلیں نکلیں جو صرف ایک اللہ کی عبادت کریں“ ۔چنانچہ تاریخ کی رو سے دس بارہ سال گزرنے پر ہی آپ ﷺ کے عین حیات طائف کی پوری آبادی مسلمان ہو جاتی ہے ۔یعنی ایک طرف کیسی پستی اور دوسری طرف کیسی بلندی کا مظاہرہ ہے ۔

۲۔دوران سفر آنحضور ﷺ چند روز نخلہ کے مقام پر تشریف فرما ہوئے ۔یہاں سے مکہ ایک دن و رات کی مسافت پر تھا ۔مکہ و طائف کے درمیان اس مقام بطن نخلہ میں قیام کے ایام میں ایک دن آپ ﷺ (عشا، تہجد یا فجر کی) نماز میں قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا ۔وہ گروہ آپ ﷺ کی قرأت سننے کے لئے ٹھہر گیا، پھر خاموشی سے سن کر چلا گیا اور ایمان سے مشرف ہو کر اپنی قوم میں دعوت حق، دعوت قرآن کا مبلغ بن گیا ۔(۱۷۷)سورۂ احقاف میں اس واقعے کا ذکر ہے ۔(۱۷۸)اس واقعے نے اور بعد میں متعدد بار جنوں کے وفود کی آمد اور قبول ایمان کے واقعات نے واضح کیا کہ بعض انسان اگرچہ آپ ﷺ کی دعوت کا انکار کر رہے ہیں اور رو رہا گ رہے ہیں لیکن جنوں کی جماعت اسے قبول کر کے اپنی قوم میں پھیلا رہی ہے ۔ایک ایسے موقع پر جب کہ اہل مکہ و طائف دعوت حق کو سننے اور ماننے سے انکار کر رہے تھے جنوں کا قبول ایمان اس عالم مایوسی و دل شکستگی میں یقیناً تازہ ہوا کا جھونکا تھا، اور اشاعت اسلام کی وسعت اور تسلسل کو ظاہر کر رہا تھا، اور آپ ﷺ کے لئے تسلی کا باعث تھا کہ آپ ﷺ کی محنت رائیگاں نہیں گئی بلکہ دعوت نبوی کا عالمی، بین الاقوامی رخ (تمام جن وانس کے لئے ہادی، نبی و رسول، بشیر و نذیر) نمایاں ہوتا چلا گیا ۔

۳۔کامیابی کا ایک اور مرحلہ اس وقت آیا جب کہ سفر طائف سے واپس مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد

آنحضرت ﷺ نے اپنی مساعیِ تبلیغ میں زیادہ توجہ مکہ مکرمہ میں حج و زیارت کعبہ کے لئے آنے والے افراد کی طرف مرکوز فرمائی، نیز مضافات مکہ میں لگنے والے بازاروں عکاظ، مجنہ، ذی المجاز وغیرہ کا دورہ فرما کر عوام الناس کے سامنے توحیدِ الٰہی کی دعوت پیش کی اور اپنی نبوت و رسالت پر گواہ بنایا۔ **عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال کان النبی ﷺ یعرض نفسہ علی الناس فی الموقف و یقول یا ایھا الناس ان اللہ یامرکم ان تعبدوہ و لا تشرکوا بہ شیئا۔** (۱/۱۷۸) اسی سلسلہ ہائے تبلیغ و دعوت میں عقبہ کے مقام پر مدینہ سے آئے ہوئے خزرجیوں پر بھی آنحضور ﷺ نے دعوت اسلام کو پیش کیا تو ان میں سے چھ آدمی بلاتردد ایمان لے آئے (۱۷۹)۔ یہ ۱۰ نبوی میں پیش آنے والا وہ واقعہ ہے، جس نے بعد کی تاریخ پر غیر معمولی اثرات مرتب کئے۔ اس کے نتیجے میں اگلے سال ۱۱ نبوی میں بیعت عقبہ اولیٰ اور اس سے اگلے سال ذی الحجہ ۱۲ نبوی کے ایام تشریق میں بیعت عقبہ ثانیہ میں اوس و خزرج کے سربرآوردہ ۷۵ افراد نے اس معاہدہ عمرانی کو جنم دیا جو نہ صرف یہ کہ مسلمانان مکہ کی ہجرت مدینہ کا سب سے بڑا سبب بنا، بلکہ ہجری ۶۲۲ء میں آنحضور ﷺ کی سربراہی میں مملکت مدینہ کے قیام کا باعث ہوا۔

۴۔ واقعہ سفر طائف کے بعد کم و بیش اسی زمانے میں (۱۰ نبوی، ۶۲۰ء/۱۱ نبوی، ۶۲۱ء/۱۲ نبوی، ۶۲۲ء) واقعۂ اسراء و معراج پیش آیا (۱۸۰)۔ اس میں شک نہیں کہ اصحاب سیر اور مؤرخین کے ہاں اس واقعے کے زمانے کے تعین میں اختلاف ہے اور اس کے وقوع کا حتمی تعین مختلف فیہ ہے۔ تاہم رجحان اس طرف پایا جاتا ہے کہ واقعۂ اسراء اور معراج ہجرت مدینہ سے ایک سال پہلے، رجب کی ستائیسویں شب میں پیش آیا تھا (۱۸۱)۔ یہ واقعہ ایک طرف تو صاحب قاب قوسین، حضور سرور کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتی حیثیت میں علوِ مرتبت اور ارتفاع مکانی کے عروج لامتناہی کو ظاہر کرتا ہے، اور دوسری طرف یہ شرف آدمیت و انسانیت اور عروج آدم خاکی کو ثابت کرتا ہے۔ محمد رواس قلعہ جی نے تہذیب سیرۃ ابن ہشام کے حاشیے میں لکھا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور جناب ابو طالب کی وفات اور حضرت رسول مقبول ﷺ پر کفار و مشرکین کی اذیت رسانی کے بعد اسراء و معراج کا واقعہ آنحضور ﷺ کے لئے اللہ کریم کی خصوصی توجہ اور رعایت کا مظہر ہے، گویا کہ وہ آپ ﷺ سے یہ فرما رہا ہے کہ دنیا والے اگرچہ آپ کے لئے زحمت و اذیت کا باعث ہیں، لیکن اللہ آسمان والوں میں آپ ﷺ کو مرحبا کہہ رہا ہے، اور اگرچہ بظاہر زمین آپ ﷺ پر تنگ ہو گئی ہے لیکن آسمان کی وسعتیں آپ کے کھول دی گئی ہیں (۱۸۲)۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہو سکتا کہ سفر طائف سے واپسی کے درمیان فتوحات

باطنی و روحانی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ بصورت معراج اپنے نقطۂ کمال کو پہنچا۔ اور ظاہری اور مادی اعتبار سے بھی دعوتی و تبلیغی مساعی کا مسلسل فروغ بالآخر بیعت عقبۂ اول اور واقعۂ معراج کے بعد بیعت عقبۂ ثانیہ پر منتج ہوا۔ معراج میں فرضیت نماز کے ذریعے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو فکر و نظر میں کامل انضباط عطا ہوا، بلکہ معاشرتی و اجتماعی زندگی کے رہنما اصول معراج کے بعد نازل ہونے والی سورۃ الاسراء میں متعین و مشخص کر دیئے گئے (۱۸۳)۔ چنانچہ اگلے چند ماہ کے اندر ہجرت مدینہ اور پھر عقبۂ کبیرہ کے معاہدۂ عمرانی کی بنیاد پر شہری مملکت مدینہ کا قیام عمل میں آ گیا۔ اس دوران مخالفت قریش کی حد انتہا یہ پہنچی کہ ان کے بڑے سرغنوں نے دارالندوہ میں بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کر لیا کہ آنحضور ﷺ کی شمع حیات ہی کو گل کر دیا جائے۔ اس فیصلے میں یہ بات شامل تھی کہ ناپاک منصوبے میں متعدد قبائل کے نمائندہ افراد اور شمشیر بردار شامل ہوں گے، تا کہ بنو ہاشم کے لئے کسی سے قصاص و دیت کا مطالبہ مشکل ہو جائے۔ مگر چشم تاریخ نے دیکھا کہ کفار و مشرکین مکہ کے سارے انتظامات دھرے رہ گئے اور اللہ کا فرستادہ پیغمبر، اللہ کی حفاظت میں ان کے سامنے سے نکل کر شاہراہ ہجرت پر نکل گیا اور انہیں خبر بھی نہیں ہوئی۔ یوں ایک دور ختم ہوا، تاریخ اب دوسرے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ ختم ہونے والے دور کا ماحصل یہ نکلا کہ حضرت رسول مقبول نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بحیثیت بشیر و نذیر (۱۸۴) ہادی و رہبر (۱۸۵) اپنے تمام مراحل دعوت میں کامیاب و کامران رہے، اور ایک غافل (۱۸۶)، جاہل (۱۸۷)، سرکش (۱۸۸)، جھگڑالو (۱۸۹) ظالم و گمراہ (۱۹۰)، کوتاہ نظر (۱۹۱)، ناعاقبت اندیش (۱۹۲)، قوم کو مختصر سی مدت میں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

۵۔ اسباب مخالفت قریش

گزشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا جا چکا، اسے ہم اگر اصل عنوان کا پس منظر تصور کر لیں تو گویا اب ہم فکر کی اس منزل تک آ گئے ہیں کہ اسباب و عوامل مخالفت قریش کا مطالعہ کر سکیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ زیر بحث مسئلے میں حضرت شبلی کے افکار و فرمودات کی روشنی شامل حال رہے گی۔ اسباب کا جائزہ حسب ذیل ہے:

۱۔ قرآن اور تاریخ انبیاء و رسل کے پیش نظر مخالفت و مخاصمت دراصل دعوت حق کی ایک علامت، پہچان اور میزان ہے۔ اسے ہم لازمۂ دعوت حق اور اس کا نتیجہ، اس کا جزو نہاں اور فطری تقاضا بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ جیسے ہی انبیاء و رسل اور ہادیان برحق کی طرف سے دعوت کا آغاز ہوتا ہے تو مخالفت و مخاصمت شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی جہاں دعوت حق ہوتی ہے وہیں مخالفت مد مقابل آ جاتی ہے۔ چنانچہ

پیغمبران کرام اور رہبران عظام کی پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ ہر زمانے میں، ہر جگہ، ہر قوم نے، ہر مرتبہ دعوت حق، پیغام الٰہی، تعلیم رسالت، تلقین نبوت اور ہدایت ربانی کی مخالفت ضرور کی (۱۹۳) اور رد و انکار کی ہر صورت اختیار کر کے اور ظلم و انتہا کی ہر انتہا تک پہنچ کر مخالفت و مخاصمت کا علم بلند کیا۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے طویل ترین دور سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مختصر ترین دور تک مخالفین حق کا رویہ اور سلوک ہمیشہ یکساں رہا ہے (۱۹۴)۔ اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ فخر الرسل، سید الانبیاء، خاتم النبیین، ہادیٔ اعظم، نجات دہندہ انسانیت، حضور اکرم ﷺ قوم قریش میں جلوہ گر ہوتے، دعوت حق پیش فرماتے تو مخاطبین کسی مخالفت و عداوت کا اظہار نہ کرتے، اس کا انکار و استرداد نہ کرتے۔ حق جب بھی آیا اسے جھٹلایا گیا، وہ کیوں نہ جھٹلاتے۔ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ (۱/۱۹۴) بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِيجٍ (۲/۱۹۴) وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ (۳/۱۹۴) چنانچہ آپ ﷺ سچا دین دین حق، بندگی رب کا پیغام فلاح، اور دین و دنیا میں کامیابی و کامرانی کا نسخہ کیمیا لے کر مبعوث ہوئے تو آپ ﷺ کی مخالفت کی گئی، مخالفت نہ کی جاتی تو تعجب ہو سکتا تھا۔ آپ ﷺ کو جھٹلایا نہ جاتا، طرح طرح کے الزامات مثلاً ہم جیسا ہے (۱۹۵)، شاعر ہے (۱۹۶) مجنون ہے (۱۹۷)، جادو کے زیر اثر بلکہ خود جادوگر ہے (۱۹۸)۔ کاہن ہے (۱۹۹) وغیرہ وغیرہ نہ لگائے جاتے تو حیرت ہو سکتی تھی۔ آپ کو ستایا نہ جاتا، آپ ﷺ کو مختلف النوع اذیتیں نہ دی جاتیں تو آپ کی الہامی حیثیت اور فرض منصبی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔ گویا دعوت حق کی شناخت اور پہچان یہی ہے کہ وہ پیغام حیات اشراف قوم، سرداروں، سرمایہ داروں، دنیا داروں، عیش پرستوں، مترفین اور مستعزین کے حلق سے نیچے بہ آسانی نہیں اتر پاتا۔ حق ہمیشہ کڑوا اور سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے۔ اس کی شیرینی صرف ان لوگوں کو محسوس ہوتی ہے جن کا باطن پاکیزہ، ظاہر آراستہ، اور فطرت سلیم ہو، جن کی روح آسودہ، اخلاق حمیدہ، اوصاف پسندیدہ ہوں اور سلامتی و راستی جن کے ضمیر میں شامل ہو۔

دعوت حق اور اس کے مقابل انکار، استرداد اور مخاصمت و مخالفت کے درمیان تلازم ایسا گہرا ہے کہ یہ انبیاء اور رسل سے ہی مخصوص نہیں، حق آگاہ، عام مصلحین انسانیت اور داعیان خیر و فلاح کے ساتھ بھی معاملہ مختلف نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بعثت سے قبل حنفاء (۲۰۰) میں سے ایک اہم فرد اور داعیٔ خیر جناب زید بن عمرو بن نفیل کی مثال پیش کی جا سکتی ہے (۲۰۱)، جناب زید حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے والد تھے۔ ابن اسحاق نے اپنی

کتاب سیرت میں جو تفصیلات درج کی ہیں، اس کے مطابق وہ حنفاء میں سے (دین ابراہیمی کے پیروکار) تھے اور علی الاعلان خانہ کعبہ میں کھڑے ہو کر کہا کرتے تھے "اے گروہ قریش اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں زید کی جان ہے، میرے سوا تم میں کوئی بھی دین ابراہیمی پر کاربند نہیں ہے (۲۰۲)۔ وہ موحد تھے انہوں نے مکہ کے اس کافرانہ، بت پرستانہ ماحول میں لات وعزیٰ اور دوسرے بتوں سے کنارہ کشی اختیار کی۔ وہ ایک اللہ، رب کی عبادت کے متمنی تھے۔ وہ خانہ کعبہ میں داخل ہو کر اللہ کو مخاطب کر کے کہتے" اے اللہ میں سچائی کے ساتھ تیرے حضور حاضر ہوں تیرا بندہ اور تیرا غلام ہوں، میں ہر اس چیز سے پناہ مانگتا ہوں جس سے ابراہیم علیہ السلام نے پناہ مانگی تھی" (۲۰۳)۔ قریش نے زید کے متعلق مشہور کر رکھا تھا کہ انہوں نے قریش کا آبائی دین ترک کر دیا ہے اور وہ قریشیوں سے الگ ہو کر بالائی مکہ میں سکونت پذیر ہو گیا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت اتنی تھی کہ زید بن عمرو کے اعلان حق، ترک دین قریش، لات منات ہبل عزیٰ اور بت پرستی کی مذمت کو اہل مکہ برداشت نہ کر سکے۔ زید خود قریشی تھے اور بنو عدی کے ایک فرد تھے مگر سب سے زیادہ آزمائشوں کا سامنا زید کو اپنوں کی طرف سے ہی کرنا پڑا۔ ان پر سب سے زیادہ ظلم وستم خطاب ڈھاتا تھا۔ وہ قریشی نوجوانوں اور بیوقوں میں سے کچھ کو زید کے پیچھے لگا دیتا، جو اسے مکہ سے باہر نکال آتے اور جب اہل مکہ کو زید کے مکہ واپس آنے کا پتہ چلتا تو وہ خطاب کو اطلاع کر دیتے، تاکہ زید کہیں ان کے دین میں فساد نہ برپا کر دے اور ان میں سے کوئی ان سے کٹ کر اس کا پیروکار نہ بن جائے (۲۰۴)۔ چنانچہ زید مکہ کی بالائی جانب چلے گئے اور حراء میں پناہ گزیں ہو گئے (۲۰۵)۔ آخر کار اس مرد آگاہ کو حضور ﷺ کی بعثت سے پانچ سال پہلے بلادلخم میں قتل کر دیا گیا (۲۰۶)۔

زید کے قتل پر افسوس کرنے والوں میں سے ایک قابل ذکر شخصیت ورقہ بن نوفل (۲۰۷) کی ہے۔ ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصیٰ بن کلاب کے بارے میں مشہور ومعروف حوالہ جو بخاری (۲۰۸) اور دیگر کتب حدیث کے علاوہ اکثر وبیشتر کتب سیرت میں پایا جاتا ہے۔ جس کے مطابق غار حراء میں پہلی وحی کے نزول کے بعد، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنی تسلی وتشفی کے لئے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں ورقہ نے آپ ﷺ سے غار حراء کا ماجرا سن کر نہ صرف یہ کہ آپ کے نبی مرسل ہونے کی تصدیق وتائید کی بلکہ مدد وتعاون کے متمنی ہوئے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کے بارے میں کہا "ھـٰذا الناموس الذی انزل علیٰ موسیٰ علیه السلام یا لیتنی فیها جذعا (۰۹)" یہی ہے وہ ناموس جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا" اور یہ وضاحت بھی کہ آپ وہی

o\Alsera

رسول ہیں جن کی بشارت ابن مریم علیہ السلام نے دی تھی (۲۱۰)۔ نیز یہ کہا کہ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ ﷺ کی قوم آپ کو نکالے گی (۲۱۱) پھر آپ کے استفسار پر ورقہ نے یہ بھی بتایا کہ اس دنیا میں جو بھی نبوت و رسالت لے کر آیا اس سے عداوت ہی کی گئی (۲۱۲) اسے اذیت ہی دی گئی (۲۱۳) اور آخر کار یہ عزم و اطلاع کہ زندہ رہنے کی صورت میں ورقہ کی بھرپور مدد و اعانت کا وعدہ ہے (۲۱۴)

ورقہ کا انتقال اگرچہ تھوڑی ہی مدت میں ہو گیا (۲۱۵)۔ تاہم ایک اہم بات جو اکثر و بیشتر نظر انداز کر دی جاتی ہے یہ کہ نبی مکرم، ﷺ کی تصدیق و تائید اور عزم و نصرت کی پاداش میں قریش کی طرف سے زید بن عمرو کی طرح خود ورقہ کی بھی مخالفت کی گئی اور اسے سب و شتم کیا گیا۔ ابن اسحاق کے مطابق ورقہ کے ایک بھائی نے ورقہ کی بے عزتی کی۔ اس نے ورقہ کو پکڑ لیا اور گالیاں دیں (۲۱۶)۔

ورقہ بن نوفل کی طرف سے حضور اکرم ﷺ کی تصدیق و تائید اور عزم و نصرت کا واقعہ اگر اسلامی مآخذ اور مسلمان اکثریت کے مطابق ورقہ کے ایمان و اسلام کے معنی میں لیا جائے تب بھی بہت اہم اور دور رس نتائج و اثرات کا حامل ہے (۲۱۷)۔ اور اگر مثلاً واٹ کے اصرار کے مطابق ایک جید نصرانی عالم کی محض توثیق پر محمول کیا جائے (۲۱۸) تب بھی اہم ہے لیکن اس واقعہ کی معنویت اور اہمیت مخالفت قریش کے پس منظر میں دوچند ہو جاتی ہے۔ جب کہ اس تصدیق رسالت اور تائید نبوت کے نتیجے میں ورقہ کا اپنے ہی بھائی کی طرف سے بے عزتی، سب و شتم اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ عرصے تک نہ جی سکے کہ وہ بہت بوڑھے، کمزور و نابینا ہو گئے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آخر عمر میں بھائی کی طرف سے یہ بے عزتی، سب و شتم اور بدسلوکی نیز ساری عمر کی عزت شہرت اور ساکھ کو اپنوں ہی کی طرف سے ٹھکانے لگانے کا صدمہ جان لیوا ثابت ہوا ہو۔

بہر حال اس کا مطلب یہ ہے کہ (ورقہ کو مسلمان ماننے کی صورت میں) تبلیغ دین، اشاعت اسلام اور دعوت حق کے جائزے اور مسلمانوں کی تعداد اور سابقون الاولون کے تعین و تحقیق کے لئے ہمیں گویا متعدد حقائق کا از سر نو مطالعہ کرنا ہوگا۔ مثلاً یہی بات کہ غار حراء میں نزول وحی، رویت جبریل اور آغاز نبوت کے ساتھ ہی جناب ورقہ بن نوفل کی تصدیق و تائید اور اس سلسلے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ملاقات (۲۱۹) اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۲۲۰) اور خود آنحضرت ﷺ سے ورقہ کی گفتگو (۲۲۱) (کیا صرف ایک مرتبہ؟) نیز ورقہ کے قبول اسلام یا ایک نصرانی عالم کی حیثیت سے محض توثیق و تصدیق کے نتائج و ثمرات و اثرات کیا مرتب ہوئے؟ اس پر مستزاد جناب ورقہ کے ساتھ اس کے بھائی، خاندان، قریش کی بدسلوکی کو دیکھتے ہوئے (عہد رسالت میں) مخالفت قریش کا آغاز کیا اسی واقعے (ورقہ بن نوفل کی تصدیق و

تائید) سے نہ کرنا چاہیے؟ اور کیا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مخالفت قریش کی بسم اللہ دراصل آغاز وحی و نبوت کے ساتھ ہی ہوگئی تھی۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ورقہ مکہ معظمہ میں آتے جاتے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرتے۔ جب کہ انہیں اسلام قبول کرنے پر طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا اور وہ ہر حال میں احد احد ہی کہے جاتے تھے، تو ورقہ کہتے تھے کہ بخدا اے بلال و اللہ ایک ہی ہے، وہ یکتا ہے، بلاشبہ اللہ ایک ہے (۲۴۲) یہ روایت زبان حال سے (اہل ایمان کے لئے) ورقہ کی ہمدردی، تلقین استقامت، صبر و رضا اور علی الاعلان شہادت توحید کو ظاہر کر رہی ہے۔

مختصر یہ کہ مخالفت قریش اور دعوت نبوت اور تبلیغ رسالت کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا اور بطور حقیقت نفس الامری اس مخالفت نے پیغام رسالت مآب کی حقانیت کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا اور انبیاء و رسل ما سبق کی تاریخ سے اسے اس طرح مربوط و مسلسل کر دیا کہ جہاں حق ہوتا ہے وہاں اس کی مخالفت لازماً کی جاتی ہے۔ (جاری)

حواشی وحوالہ جات

۹۹۔ قرآن کی (سورہ ۱۱۱) اللھب یا المسد کے شان نزول میں تمام مفسرین نے بالاتفاق اس کا مصداق ابولہب کو ہی قرار دیا ہے۔ اس سورہ کی پہلی آیت میں ہے **تبت یدا ابی لھب و تب** ''ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو''۔ ابولہب سے یقیناً مراد عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب ہے۔ جو رسول اکرم ﷺ کا حقیقی چچا تھا اور چہرے کی چمک دمک کے باعث ابولہب (شعلہ رو) کے نام سے مشہور تھا۔ اور چوتھی آیت میں ہے **وامراتہ حمالۃ الحطب** ''اس کی بیوی ام جمیل (اروی بن حرب بن امیہ) ایندھن ڈھونے والی''۔ تفسیر ابن کثیر کے مطابق اس سورہ میں معجزہ ظاہر کا بیان، دلیل نبوت واضحہ ہے۔ ابولہب کی شقاوت کی خبر اور عدم ایمان کا ثبوت (تفصیل کے لئے دیکھیے۔ ابن کثیر/ تفسیر القرآن العظیم/ بیروت ۱۹۶۶ء/ ج ۷، ص ۳۹۹ تا ۴۰۱) ہمارے ہاں کے بعض مترجمین و مفسرین پہلی آیت کو بددعا قرار دیتے ہیں۔ مثلاً فتح محمد جالندھری اور مولانا تھانوی۔ جب کہ دوسرے حضرات اسے بددعا نہیں مانتے، دونوں جملوں کو واقعے کی خبر قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک اس آیت اور اس کے دونوں جملوں میں ابولہب کی ناکامی اور ہلاکت و بربادی کی پیشین گوئی ہے۔ مثلاً شاہ عبدالقادر، شیخ الہند، شبیر احمد عثمانی، مودودی، اصلاحی، فراہی وغیرہ۔ جب کہ سید قطب اپنی تفسیر ظلال القرآن میں پہلے جملے کو بددعا اور دوسرے جملے کو اس کا ظہور اور اظہار واقعہ قرار دیتے ہیں۔ (تفسیر فی ظلال القرآن/ سید قطب/ اردو ترجمہ، سید حامد علی/ البدر پبلی کیشنز، لاہور/ ۱۹۸۷ء پارہ عم/ ص ۴۶۵ تا ۴۷۳) بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ **وکان کثیر الاذیۃ لرسول اللہ والبغضۃ لہ و الازدراء بہ والتنقص لہ و لدینہ** (ابن کثیر/ ج ۷، ص ۳۹۹)

۹۹/ ۱۔ **ولقد اخذ ابو لھب موقفۃ ھذا من رسول اللہ منذ الیوم الاول** ابوزہرہ، ص ۲۸۲

Alsera

۱۰۰۔ابن اسحاق/ سیرۃ۔ص۱۷۲۔

۱۰۰/ا۔شعراء:۲۱۴

۱۰۱۔اپنے خاندان والوں کو آنحضرت ﷺ نے کھانے پر کئی مرتبہ جمع کیا، جس کی تفصیلات مآخذ میں موجود ہیں (مثلاً ابن اسحاق/ص۱۴۹)۔ابن الاثیر کے مطابق حکم الٰہی وانذر عشیرتک الاقربین کی متابعت میں جب آنحضور ﷺ نے دعوت ذوالعشیرہ کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ کی چچیوں پھوپھیوں وغیرہ نے کہا سب کو بلایئے مگر ابو لہب کو نہیں۔ کیونکہ وہ آپ کی بات نہیں مانے گا۔پس آپ ﷺ نے ابولہب کے علاوہ سب کو بلایا، وہ سب آئے ان میں بنی مطلب بن عبد مناف بھی تھے، یہ سب ۴۵ اشخاص تھے، ابولہب خود بخود آ گیا اور کہنے لگا ''یہ سب آپ کے چچا اور چچا زاد بھائی ہیں ان کی باتیں کیجئے مگر بے دینی کی بات چھوڑ دیجئے اور یہ جان لیجئے کہ آپ کے قبیلے کو پورے عرب سے مقابلے کی طاقت نہیں ہے'' اس پر حضور ﷺ خاموش رہے اور مجلس میں کچھ نہیں فرمایا۔پھر دوسری بار آپ ﷺ نے دعوت کا اہتمام فرمایا، پھر خاندان والے جمع ہوئے۔اس وقت آنحضور نے البتہ کلام فرمایا اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد ارشاد ہوا: **ان الرائد لا یکذب اهله و الله الذی لا اله الا هو انی رسول الله الیکم خاصة و الی الناس عامة**، ابوطالب آپ کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے، لیکن ابولہب مخاطب ہوا کہ واللہ یہ بات ٹھیک نہیں۔قبل اس کے دوسرے ان کو روکیں تو کیں ابو طالب آپ ان کے ہاتھوں کو باندھ دیں۔ابوطالب کہنے لگے جب تک ہم زندہ ہیں روکنے والوں کو روکیں گے (ابن الاثیر/ الکامل/ ج۱،ص۵۸۴،۵۸۵)

ابن الاثیر نے پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے دعوتوں کی کچھ تفصیل دی ہے، جن کا انتظام و انصرام حضور ﷺ کے حکم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔چنانچہ ایک موقع پر کم و بیش چالیس عزیز رشتہ دار جمع ہوئے اور معجزۂ نبوی سے تھوڑا سا کھانا اور دودھ سب کی شکم سیری کا باعث بن گیا اور اس سے پہلے کہ رسول خدا ﷺ تکلم فرماتے ابولہب بول اٹھا تم لوگوں نے صاحب خانہ کی جادوگری دیکھ لی نا۔چنانچہ لوگ اٹھ کر چل دیئے اور آنحضور ﷺ ان سے کچھ نہ فرما سکے۔ابن اسحاق کے مطابق ابولہب نے حاضرین سے کہا تھا کہ تمہارے اس ساتھی کی جادوگری تم پر نہ چل جائے (ابن اسحاق/ سیرۃ/ص۱۴۹)۔لیکن حضور ﷺ نے بھی ہمت نہیں ہاری اور حضرت علی کو ایک اور دعوت کے انتظام کا حکم ارشاد فرمایا، اور اس میں البتہ آپ ﷺ نے پوری بات ان کے سامنے رکھی اور ان سے مدد و معاونت کا مطالبہ فرمایا۔**یا بنی عبدالمطلب انی والله ما اعلم شاباً فی العرب جاء قومه بافضل مما قد جئتکم به، قد جئتکم خیر الدنیا والآخرة و قد امرنی الله تعالیٰ ان ادعوکم الیه فانکم یوازرنی علی هذا الامر علی ان یکون اخی ووصی و خلیفتی فیکم؟ فاحجم القوم عنها جمیعاً**۔(دیکھئے: ابن الاثیر/ الکامل/ ج۱،ص۵۸۶ ملخصاً)۔

۱۰۲۔دیکھئے تفسیر ابن کثیر/ ج۷،ص۳۹۹ (بحوالہ بخاری عن ابن عباس) مؤرخین اور اصحاب سیر نے وانذر عشیرتک الاقربین کے حوالے سے حضور ﷺ کے خطاب عام کا واقعہ کوہ صفا سے مختص کیا ہے لیکن یعقوبی نے یہ عجیب و غریب جملے کہے ہیں کہ **فوقف علی المروة ثم نادیٰ باعلی صوته یا آل فهر، فاجتمعت الیه بطون قریش حتی لم یبق احد منهم** (یعقوبی/ تاریخ / ج۲،ص۱۷)۔

Alsera

۱۰۳۔ تفسیر ابن کثیر/ ج۷، ص۴۰۰۔

۱۰۴۔ ایضاً

۱۰۵۔ ایضاً

۱۰۶۔ سید قطب/ فی ظلال القرآن/ تفسیر/ دار احیاء التراث الاسلامی، بیروت/ المجلد الثامن (الجزء الثلاثون)، ص۲۸۲۔

۱۰۷۔ سید حامد علی/ اردو ترجمہ تفسیر فی ظلال القرآن/ پارہ عم/ ص۴۷۰۔

۱۰۷/ المنٹگمری واٹ/ ص۹۳ تا ۱۳۴

۱۰۸۔ سیرۃ ابن اسحاق/ ص۱۹۶۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ سے یہ دعا مانگی تھی ''اے اللہ ابی جہل بن ہشام یا عمر بن خطاب کے ذریعے اسلام کی تائید فرما''۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا اور پھر باہر نکل کر مسجد میں علانیہ نماز ادا کی۔ ابن ہشام کے یہاں الفاظ دعا یہ منقول ہیں: **اللھم ایدالاسلام بابی الحکم بن ھشام او العمر الخطاب** (ج۱، ص۴۷۰)۔

۱۰۹۔ سیرۃ ابن اسحاق/ ص۲۲۵۔

۱۱۰۔ **قال: فکبر رسول اللہ ﷺ تکبیرۃً عرف اھل البیت من اصحاب الرسول ان عمر قد اسلم** (ابن ہشام/ ج۱، ص۳۷۱)۔

۱۱۱۔ ابوجہل کی اس حکمت عملی کو واٹ نے بھی نوٹ کیا ہے۔ (دیکھئے: محمد ایٹ مکہ/ ص۱۱۷، ۱۱۸)

۱۱۲۔ سیرۃ ابن اسحاق/ ص۲۲۳۔

۱۱۳۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: ایضاً/ ص۲۱۱۔ ابن اسحاق نے کہا مجھ سے ذکر کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ جبریل علیہ السلام تھے، اگر ابوجہل قریب آتا تو جبریل اسے پکڑ لیتے۔ (ایضاً)

۱۱۴۔ تفسیر ابن کثیر/ ج۷، ص۳۲۷۔ سورۂ علق کی متعلقہ آیات ۹۔۱۶ کا ترجمہ یہ ہے: ہرگز نہیں! انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی طرف ہے۔ تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر (وہ بندہ) راہ راست پر ہو یا پرہیز گاری کی تلقین کرتا ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے (یہ منع کرنے والا شخص حق کو) جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟ ہرگز نہیں، اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر اسے کھینچیں گے اس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطا کار ہے۔ وہ بلالے اپنے حامیوں کی ٹولی کو، ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلالیں گے۔ ہرگز نہیں اس بات کو نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو۔ اس کی شان نزول میں مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ اس سورہ کا دوسرا حصہ اس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ ﷺ نے حرم میں اسلامی طریقے سے نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل نے آپ کو ڈرا دھمکا کر اس سے روکنا چاہا (ایضاً/ ص۳۹۴)۔

۱۱۵۔ ابن کثیر/ تفسیر/ ج۷، ص۳۲۸۔

۱۱۶۔ ایضاً۔

۱۱۷۔ ابن اسحاق/ سیرۃ/ ص ۲۲۳۔

۱۱۸۔ الانعام: ۳۳۔ اس آیت کی تفسیر میں ابن کثیر نے جو تفصیل دی ہے اس کے مطابق محمد بن اسحاق نے بہ روایت زہری ابی جہل کے قصے میں ابوجہل، ابوسفیان، اور اخنس بن شریق کا راتوں کو چھپ چھپ کر آنحضور ﷺ کے دہن مبارک سے قرآن سننا، پھر صبح دم ایک دوسرے سے مڈ بھیڑ ہونے پر شرمندہ ہونا، پھر نہ آنے کا وعدہ کرنا اور پھر تین راتوں تک تلاوت و حلاوت قرآن سے لطف اندوز ہونے اور دہن مبارک نبوی سے کلام الٰہی کی لذت میں رات بسر کرنے میں تینوں کا الگ الگ آنا اور صبح کے وقت واپسی میں ان کی مڈ بھیڑ ہونا اور آپس میں شرمندہ ہو کر آئندہ نہ آنے کا عہد کر کے منتشر ہو جانا منقول ہے۔ پھر صبح اچھی طرح ہو گئی تو اخنس بن شریق ابوسفیان کے گھر آیا اور پوچھا تم نے جو کچھ محمد ﷺ سے سنا اس کے بارے میں کیا تاثر ہے؟ اس نے کہا اے ابوثعلبہ بخدا میں نے وہ باتیں سنی ہیں جنہیں میں سمجھتا ہوں اور ان کی مراد کو بھی اور بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کے مفہوم و مراد کو میں نہیں سمجھا۔ اخنس کہنے لگا "میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میرا بھی یہی حال ہے" پھر وہاں سے نکل کر وہ ابوجہل کے یہاں گیا اور وہی سوال اس سے پوچھا تو ابوجہل نے جواب دیا: سنا کیا ہے؟ ہم میں اور بنو عبد مناف میں شرافت اور بزرگی کے بارے میں جھگڑا پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے بھی کھانے کھلائے اور ہم نے بھی۔ انہوں نے بھی ذمے داریوں کے بوجھ اٹھائے اور ہم نے بھی، انہوں نے بھی لوگوں کو عطیات دیئے اور ہم نے بھی، یہاں تک کہ جب ہم اور وہ برابر کی ٹکر کے ہو گئے اور ہماری اور ان کی حالت شرط کے دو گھوڑوں کی سی ہو گئی تو وہ کہنے لگے کہ ہم میں ایک نبی ہے جس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے، بھلا یہ اعزاز ہمیں کہاں سے مل سکتا ہے؟ بخدا ہم اس (نبی ﷺ) پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے۔ اس کے بعد اخنس اس کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا (ابن کثیر/ تفسیر/ دار الاندلس بیروت ۱۹۶۶ء/ ص ۱۸)۔ ابن کثیر نے آگے چل کر سورہ انعام کی اسی آیت (**قد نعلم فانهم لا يكذبونك** (۳۳)) کے ضمن میں اخنس بن شریق اور ابوجہل کا بدر کے موقع پر تخلیے میں مکالمہ نقل کیا ہے۔ اور اخنس کے اس سوال کے جواب میں کہ **يا ابا الحكم اخبرني عن محمدأ صادق هو ام كاذب فانه ليس هاهنا من قريش غيري و غيرك يستمع كلامنا؟ فقال ابو جهل ويحك والله ان محمداً لصادق وما كذاب محمد قط، و لكن اذا ذهبت بنوقصيٰ باللواء و السقاية والحجابة والنبوة فماذا يكون لسائر قريش؟** اس کے اسی قول پر فرمایا گیا (**فانهم لا يكذبونك و لكن الظالمين بآيات الله يجحدون) فآيات الله محمد** ﷺ (ایضاً/ ص ۱۸، ۱۹)

۱۱۹۔ بنومخزوم میں اسلام کی سرایت اور اثرات کی تفصیل اور حوالوں کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی/ عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت/ نقوش رسول نمبر/ ج ۵، ص ۴۲۱ تا ۴۲۵۔

۱۲۰۔ ابوجہل کا حسد و جلن، بدر کے موقع پر، یعنی اپنی موت سے کچھ دیر پہلے اس مکالمے سے ظاہر ہے جو اس کے اور اخنس بن شریق کے درمیان ہوا (تفصیل کے لئے دیکھئے حاشیہ ماقبل، ص ۱۱۸) یہ اسی کی ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ تھا، ورنہ ابوسفیان نے قریش کو پیغام بھیجا تھا کہ اب (مکہ) واپس لوٹ جاؤ، کیونکہ اللہ نے قافلہ (تجارت) کو بچا لیا ہے، مگر ابوجہل نے کہا "ہم نہیں لوٹیں گے جب تک بدر نہ پہنچ جائیں۔ بدر میں بازار لگنے کا

o\Alsera

وقت آرہا ہے وہاں سوق بدر لگتا ہے۔ وہاں ہم لوگ تین دن قیام کریں گے، جانور ذبح کریں گے، کھانا کھانے کے مزے لیں گے اور ہماری خبریں عربوں کو پہنچیں گی اور وہ ہمیشہ ہم سے مرعوب رہیں گے(ابن الاثیر/ الکامل فی التاریخ / دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۸۷ء/ ج۲،ص۱۸) اس سے پہلے بھی جب ابوسفیان نے اثنائے راہ ضمضم بن عمرو الغفاری کو اجرت پر مکہ بھیج کر قریش کو مدد کے لئے پکارا تھا، لیکن ضمضم کے مکہ مکرمہ پہنچنے اور اعلان سے پہلے عاتکہ بنت عبدالمطلب نے مسلسل تین رات قریش کی تباہی پر ایک خوفناک خواب دیکھا اور یہ خبر ابوجہل کو پہنچی تو اس نے عباس بن عبدالمطلب کو بلا بھیجا، عاتکہ کے خواب کی اطلاع دی اور طنزاً کہا ''تمہارے خاندان میں یہ نبیہ کب سے پیدا ہوگئی ہے؟ یہ کافی نہ تھا کہ تمہارے ہاں مرد نبی بن بیٹھے ہیں''۔ پھر دھمکی دیتے ہوئے کہنے لگا اب ہم تمہارے بارے میں انتظار کریں گے اور دیکھیں گے کہ خواب کی یہ تینوں باتیں اگر واقعی سچ نکلیں تو ٹھیک ورنہ ہم تمہارے خاندان کے خلاف حکم لگا دیں گے کہ تمہارے سب خاندان والے پورے عرب میں سب سے زیادہ جھوٹے ہیں۔ (ایضاً /ص۱۵) پھر عین جنگ سے پہلے حکیم بن حزام، عتبہ بن ربیعہ کے پاس گیا اور جنگ روکنے کے لئے قائل کرکے یہ درخواست کی کہ آپ قوم کو واپس لے چلیں اور اپنے حلیف دوست عمرو بن الحضرمی کے خوں بہا کا بوجھ آپ اٹھالیجئے۔ عتبہ بن ربیعہ نے جواب دیا کہ میں نے قبول کرلیا خون بہا بھی دوں گا اور جو مال اس کا ضائع ہوا ہے اس کا تاوان بھی دوں گا، تب حکیم بن حزام نے کہا اب ابن حنظلیہ یعنی ابوجہل کے پاس چلئے اس لئے کہ میں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا کہ وہی قوم کا کام بگاڑ دے گا (ایضاً /ص۲۱) اس وقت بھی ابوجہل نے عتبہ کو بزدلی کا طعنہ دیا اور کہنے لگا ہم لوگ واللہ یہاں سے ہرگز واپس مکہ نہیں جائیں گے یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور محمد کے درمیان فیصلہ فرمادے۔ علاوہ ازیں ایک دن پہلے قریش لشکر جب جحفہ میں مقیم تھا تو جہم بن الصلت بن مخرمہ بن المطلب نے بھی قریش کی تباہی اور اشراف کے قتل کا خوفناک خواب دیکھا تو ابوجہل کا تبصرہ یہ تھا کہ ''بنی المطلب میں دوسرا نبی پیدا ہوگیا، اسے کل معلوم ہوجائے گا کہ کون قتل کیا جاتا ہے'' (ابن ہشام/ ج۲،ص۲۷۰۔ ابن الاثیر / ج۲،ص۱۹) ابوجہل کو اخنس بن شریق نے بھی سمجھایا مگر وہ نہ مانا، آخر کار اخنس جو بنی زہرہ کا حلیف تھا، بنو زہرہ کے لوگوں کو لے کر مکہ واپس لوٹ گیا اور جنگ میں شرکت نہیں کی، بنو عدی کا بھی کوئی شخص لشکر قریش کے ساتھ لڑنے نہیں آیا، طالب بن ابی طالب میدان جنگ سے مکہ لوٹ گیا (ابن ہشام/ ج۲،ص۲۷۱) مختصر یہ کہ جنگ بدر کی محض ابوجہل کی ضد، ہٹ دھرمی اور انا کے سبب نوبت آئی۔

۱۳۱۔ جنگ بدر میں بڑے بڑے سرداروں سمیت کفار و مشرکین مکہ کی بڑی تعداد (۷۰ افراد) ماری گئی۔ مقتولان کفار میں ابوجہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ شامل تھے۔ آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے مطابق ان کے لاشوں کو ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا گیا تھا۔ جب لاشے کنوئیں میں ڈالے جا چکے تو آپ ﷺ اس کنوئیں پر تشریف لائے اور خطاب فرمایا: **یا اہل القلیب بئس عشیرۃ النبی کنتم لنبیکم کذبتمونی و صدقنی الناس** ......ابن الاثیر/ ص۲۶) اے کنوئیں والو! تم نبی کے کنبے والے کتنے برے لوگ تھے تم نے مجھے جھٹلایا اور دوسروں نے میری تصدیق کی۔ پھر نام لے لے کر فرمایا۔ اے عتبہ، اے شیبہ، اے امیہ بن خلف، اے ابوجہل بن ہشام کیا تم سے جو تمہارے اللہ نے جو وعدہ کیا تھا وہ سچ ہوا۔ بے شک میں نے وہ وعدہ سچ پایا جو میرے اللہ نے مجھ

سے کیا تھا (ایضاً) ابوجہل کو قتل کرنے میں حضرت معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ اور معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہ نے حصہ لیا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک ہی وار میں اس کا سر جدا کر دیا (ایضاً/٤٣) شرکاء بدر، شہداء بدر، مقتولان کفار اور مکہ کے قیدیوں کی فہرست اور تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن حزم/ جوامع السیرۃ/ص١٢٢تا١٥٢۔

١٢٢۔ ابولہب کا انجام عبرتناک ہوا۔ وہ ایسا بزدل نکلا کہ جنگ بدر میں شرکت کے لئے خود نہیں آیا اور اپنے بجائے عاص بن ہشام بن المغیرہ کو بھیج دیا (ابن اثیر/ ج٢، ص١٥) اور اس پر احسان یہ جتایا کہ یہ ٤ ہزار درہم سے قرض کا بدل ہے۔ مکہ میں قریش کی شکست کی خبر پہنچی تو اسے اتنا صدمہ ہوا کہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ پھر اس کی موت عبرتناک ہوئی اسے عدسے کی بیماری ہو گئی (ابن الاثیر/ ج١، ص٥٩٢) اس کی گردن میں بدبودار سرطانی گلٹی نکل آئی۔ گھر والوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا کیونکہ چھوت کا ڈر تھا۔ مرنے کے بعد کوئی تین روز تک اس کے پاس کوئی نہ آیا یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گل گئی اور بدبو پھیلنے لگی، جب لوگوں نے طعنے دینے شروع کئے تو گھر والوں نے ایک روایت کے مطابق حبشیوں کو اجرت دے کر لاش اٹھوائی، دوسری روایت میں ہے کہ ایک گڑھا کھودا گیا اور لکڑیوں سے اس کی لاش دھکیل کر اس میں ڈال دی گئی اوپر سے مٹی پتھر ڈال کر ڈھک دیا گیا۔ (ایضاً) ابن اثیر کے مطابق بدر میں قریش کے قتل ہونے کے ٩ دن بعد ابولہب بھی واصل جہنم ہوا (ج٢، ص٢٨) دشمن خدا ابولہب ساری زندگی جس دین و پیغام کو روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا رہا، اور بالآخر ناکام و نامراد ہوا۔ اس کی ایک ناکامی یہ بھی تھی کہ بیٹی درّہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئی اور اسلام لائی اور فتح مکہ کے موقع پر دو بیٹے عتبہ اور معتب حضرت عباس کی وساطت سے خدمت نبوی میں پیش ہوئے اور ایمان لائے۔ ایک لڑکے عتیبہ کو حضور ﷺ کی بددعا کے نتیجے میں شیر نے پھاڑ کھایا۔ (مودودی/ ج٢، ص٥٢٦) ١٩٩١ء میں زیارت حرمین کے موقع پر راقم الحروف نے وہ جگہ دیکھی، جہاں مقامی روایات کے مطابق ابولہب کی لاش پھینکی گئی تھی کہ وہاں پورے شہر کا سیوریج کا پانی اور گندگی آ کر جمع ہوتی اور پھر نکاسی ہوتی۔ حرم کی تعمیر و توسیع کے بعد وہ جگہ معدوم ہو گئی ہے۔ اس کے پاس گزرنے والا طریق ابی لہب تا حال موجود ہے۔

١٢٣۔ اسلامی تاریخی مآخذ اور کتب سیر میں شرکائے بدر، شہداء بدر، اسیران بدر اور مقتولان کی فہرست اور تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً فہرستوں اور تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن حزم/ جوامع السیرۃ/ص١١٤تا١٥٢۔ مقتولین کفار و مشرکین مکہ کی فہرست میں مخالفین و اعدائے اسلام بھی ٤٠ سے زیادہ قتل ہوئے، مثلاً حنظلہ بن ابی سفیان، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، حارث بن عامر، زمعہ بن الاسود، الحارث بن زمعہ، عقیل بن الاسود، ابوالبختری عاص بن ہشام، طلحہ بن عبیداللہ، ابوجہل بن ہشام، عاص بن ہشام، ابوقیس بن الولید، ابوقیس بن الفاکہ، سائب بن ابی السائب، منبہ بن الحجاج، نبیہ بن الحجاج، امیہ بن الخلف، حذیفہ بن ابی حذیفہ، ہشام بن ابی حذیفہ، ختم جنگ کے بعد جن کو قتل کیا گیا، ان میں عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن الحارث بھی شامل ہیں۔ (دیکھئے: ابن حزم/ص١٤٧تا١٥١) ابن اثیر کے مطابق عقبہ بن ابی معیط عرق الظبیہ کے مقام پر مصلوب ہوا۔ پہلا شخص جسے عہد اسلام میں صلیب چڑھایا گیا۔ (ج١، ص٥٩٥)

١٢٤۔ مثلاً ولید بن مغیرہ ہجرت (رسول ﷺ) کے تین ماہ بعد ٩٥ سال کی عمر میں مر گیا (ابن الاثیر/

ج۱،ص۵۹۳۔نیز ج۲،ص۱۰۲)۔عاص بن وائل سہمی ہجرت کے دوماہ بعد پیر کا زخم خراب ہو جانے کے باعث مرا (ایضاً / ج۲،ص۱۰۴)۔زہیر بن امیہ غالباً بدر میں تو بچ گیا لیکن احد میں تیر لگنے سے موت واقع ہوئی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد یمن چلا گیا تھا اور وہیں حالت کفر میں مرگیا (ایضاً / ج۱،ص۵۹۴۔نیز ج۲،ص۱۰۶، ۱۰۷)۔اسود بن عبدالمطلب بن اسد (ابوزمعہ) اندھا ہو گیا تھا، بدر میں وہ خود، اس کا بیٹا اور پوتا بھی قتل ہوا (ایضاً / ج۱،ص۵۹۵)۔مطعم بن عدی بن نوفل جنگ بدر میں محض اپنے ساتھی کی خاطر قتل ہوا (ایضاً)۔مالک بن الطلاطلة کے سر میں پیپ بھر گئی، اسی مرض میں جان گئی (ایضاً / ج۱،ص۵۱۵)۔(ابن اسحاق کے مطابق حارث بن طلاطلة الخزاعی تھا جس کا سر متورم ہو گیا، پیپ سے بھر گیا اور موت واقع ہو گئی۔ص۲۸۸)

۱۲۵۔مثلاً ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب، عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی، ابوسفیان بن حرب اور حکم بن العاص وغیرہ (جو فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے)، دیکھئے: ابن الاثیر، ج۱،ص۵۹۶۔

۱۲۶۔ابن ہشام / ج۱،ص۲۸۵۔

۱۲۷۔احزاب:۴۵۔

۱۲۸۔المائدہ:۶۷۔

۱۲۹۔ایضاً۔

۱۳۰۔احزاب:۴۰۔

۱۳۱۔ایضاً:۴۶۔

۱۳۲۔دیکھئے: سورۃ السبا:۲۸، نیز الفرقان:۱۔

۱۳۳۔ابن اسحاق کی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کو اپنی حفاظت و نگرانی میں پروان چڑھایا اور آپ ﷺ کو جاہلیت کی گناہوں گندگیوں اور آلودگیوں سے محفوظ رکھا۔بعثت سے قبل ہی آپ ﷺ اپنی قوم میں مروت کے اعتبار سے افضل، محاسن اخلاق میں سب سے برتر اور حسب و نسب کے لحاظ سے شریف ترین سمجھے جاتے تھے۔آپ بہترین پڑوسی، اعلیٰ اخلاق کے مالک، سب سے زیادہ سچ بولنے والے اور امانتدار، برائیوں اور اخلاقی رذائل سے سب سے زیادہ بچنے والے اور پاک دامنی، اور شرافت کے حامل تھے، یہاں تک کہ اپنی قوم میں آپ ''الامین'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔آپ کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے جملہ اخلاق صالحہ جمع کر دیئے تھے''۔(ابن اسحاق/سیرۃ/ص۴۷)۔

۱۳۳/ یونس:۱۶

۱۳۴۔الجن:۲۳۔یہاں خدا کی طرف سے احکام کا اور اس کے پیغاموں کا پہنچا دینا (ہی) میرے ذمے ہے

۱۳۵۔یوسف:۱۰۸۔

۱۳۶۔الشوریٰ:۱۵۔

۱۳۷۔الرعد:۱۴۔سچا پکارنا / سچی پکار / سچی دعوت اسی (اللہ) کے لئے خاص ہے۔

۱۳۸۔قصص:۸۷۔

Alsera

۱۳۸/۱۔ غافر، ۴۲

۱۳۹۔ النحل: ۱۲۵۔

۱۴۰۔ سیرۃ ابن اسحاق: ۱۴۰۔

۱۴۱۔ ایضاً: ۱۴۲۔

۱۴۲۔ ایضاً: ۱۴۴۔

۱۴۳۔ الشعراء: ۲۱۴۔ اور اس مضمون سے آپ سب سے پہلے نزدیک کے کنبے کو ڈرایئے، امام راغب نے اس کا مادہ ع ش ر کے تحت لکھا ہے کہ العشیرہ انسان کے باپ کی طرف سے قریبی رشتہ دار پر مشتمل جماعت کے ہیں (کیونکہ ان سے انسان کو کثرت عدد حاصل ہے) گویا وہ اس کے لئے بمنزلہ عدد کامل کے ہیں کہ عشرہ کا عدد ہی کامل ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے: **وازواجکم و عشیرتکم** اور عورتیں اور خاندان کے آدمی (۹:۲۴) لہذا العشیرۃ انسان کے رشتہ داروں کی اس جماعت کا نام ہے جن سے انسان کثرت حاصل کرتا ہے نیز آگے لکھا ہے العشیر مل جل کر رہنے والا خواہ رشتہ دار ہو یا اجنبی (المفردات/ص ۳۳۵) اس مفہوم میں ایک اور لفظ قرابت دار ہے (ق ر ب) یہ قرب مکانی، زمانی، نسبی تعلق، مرتبہ و حفاظت اور قدرت کے لئے استعمال ہوتا ہے تاہم قرب نسبی میں **اولوالقربیٰ** (۴:۸۰) **الوالدان والاقربون** (۴:۷) **ولو کان ذا قربی** (۶:۱۵۲) **لذی القربی**۔ رشتہ دار ہمسائے (۴:۳۶) **یتیماً ذا مقربۃ** یتیم رشتہ دار (۹۰:۱۱۱) ایضاً/ص ۹۸، ۹۹۔

۱۴۴۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے: **النذران توجب علی نفسک لیس بواجب لحدوث امر** النذر کے معنی کسی حادثہ کی وجہ سے غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔ جبکہ الانذار کے معنی کسی خوفناک چیز سے آگاہ کرنا ہے اور اس کے مقابل تبشیر کے معنی کسی اچھی بات کی خوشخبری سنانا۔ (المفردات فی غرائب القرآن/ص ۷۴۸) اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی چیز کو جاننا اور اس سے ہوشیار اور چوکنا رہنا انذار (**نذر بالشئی**) ہے۔ چنانچہ کسی کو ہوشیار و چوکنا کرنا، متنبہ کرنا، اور کسی کو کسی چیز کے ضرر رساں اور نقصان دہ انجام سے قبل از وقوع خبردار کر دینا اور اس کے خوفناک انجام سے ڈرانا انذار کے دائرے میں آتا ہے۔ اہل عرب نذیر، النذیر العریاں، اور نذیرۃ الجیش کی روایات سے خوب واقف تھے، چنانچہ زبان رسالت مآب ﷺ سے بار بار یہ کہلایا جاتا کہ **قل انی انا النذیر المبین**۔ (الحجر: ۸۹) **و ما انا الا نذیر مبین** (احقاف: ۹)، **و جاء کم النذیر** (فاطر: ۳۷)، **ھذا نذیر من النذر الاولیٰ** (النجم: ۵۶)، **و ما ارسلناک الا مبشراً و نذیرا** (اسراء: ۱۰)، چنانچہ آپ ﷺ ایک نبی، رسول، کے ساتھ ساتھ النذیر بھی تھے جو اپنی قوم (مخاطبین) کو قبل از وقوع خطرات دین و دنیا سے متنبہ فرما رہے تھے۔ اور عذاب و ثواب سے مطلع فرما رہے تھے۔

۱۴۵۔ قرآن کی متعدد آیات میں یہ مضمون بصراحت بیان کیا گیا ہے کہ کوئی امت نذیر سے خالی نہیں رہی **وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر** (فاطر: ۲۴)، اور حضرت نوح سے لے کر آنحضور ﷺ تک تمام انبیاء و رسل انذار و تبشیر کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ چنانچہ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: **قال یا قوم انی لکم نذیر مبین** (نوح: ۲)، اور پھر عہد بہ عہد نذیر و بشیر آتے رہے اور قوم ان کی تکذیب کرتی رہی، مثلاً قوم ثمود

(القمر:۲۳)، قوم لوط (القمر:۳۳)، قوم عاد (القمر:۱۸)، قوم فرعون (القمر:۴۱)، بہرحال جس طرح ہر قوم میں منذر آتے رہے (شعراء:۲۰۸) اور مبشرین و منذرین مبعوث ہوتے رہے (البقرہ:۲۱۳) نیز الکہف (۵۶) وغیرہ، اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی انہیں میں سے ایک تھے **ھذا نذیر من النذر الاولی** (النجم:۵۶)، اس لئے آنحضور ﷺ بھی قوم قریش اور تمام اقوام عالم کے لئے **نذیر مبین** (عنکبوت:۵۰) تھے اور ہیں، چنانچہ کفار و مشرکین کے تمام جھوٹے الزامات کو دفع کرتے ہوئے فرمایا گیا: **ما بصاحبکم من جنة ان ھو الا نذیر مبین** (الاعراف:۱۸۴) اور آئندہ کے لئے اہل کتاب کے سامنے بھی حجت تمام کرتے ہوئے فرمایا گیا: **قد جاء کم رسولنا یبین لکم علی فترة من الرسل ان تقولوا ما جاءنا من بشیر ولا نذیر** (المائدہ:۱۹)

۱۴۵/۱۔ المدثر:۲

۱۴۶۔ السبا:۲۸۔

۱۴۷۔ دیکھئے: ابن اسحاق/ص ۱۴۹، ۱۵۰۔ ابن الاثیر/ الکامل/ ج ۱، ص ۵۸۶، وغیرہ۔

۱۴۸۔ مثلاً صحیح مسلم/ کتاب الایمان/ باب فی قولہ تعالی وانذر عشیرتک الاقربین میں حضرت ابن عباس کی روایت جس میں کوہ صفا پر چڑھ کر حضور ﷺ کی پکار (یا صباحاہ) پر قریش کے جمع ہونے کی تفصیل درج ہے اور آپ ﷺ کے خطاب کے بعد ابولہب کی یاوہ گوئی مذکور ہے۔ خطاب نبوی کا واحد مرکزی جملہ یہ تھا **فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید** "میں تمہیں آنے والے بہت سخت عذاب سے خبردار کرتا ہوں"۔ یہی مضمون مسند ابی عوانہ، ج ۱، ص ۹۴ اور سیرت ابن ہشام/ ج ۱، ص ۳۵۱ میں بھی پایا جاتا ہے نیز دیکھئے: ابن الاثیر/ ج ۱، ص ۵۸۴۔

۱۴۹۔ صحاح ستہ و دیگر کتب احادیث میں سورہ شعراء کی آیت: ۲۱۴، ۲۱۵ کے حوالے سے جو روایات پائی جاتی ہیں انہیں ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں ۱۔ ایک قسم تو ان روایات کی ہے جن میں یہ صریحاً ذکر ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے یا صباحاہ کی پکار کے بعد قریش کے عام و خاص کو جمع کرکے کوہ صفا پر کھڑے ہوکر خطاب فرمایا مثلاً بخاری/ کتاب التفسیر، باب قولہ وانذر عشیرتک الاقربین میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ "**صعد النبی ﷺ علی الصفا فجعل ینادی یا بنی فھر، یا بنی عدی** ...... اور دیگر تفصیلات درج ہیں، یا مثلاً کتاب الایمان، باب من مات علی الکفر فھو فی النار میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت "**قام رسول اللہ ﷺ علی الصفا** ...... الخ۔ جب کہ اس کتاب الایمان کے ایک اور باب **فی قولہ وانذر عشیرتک** ...... الخ میں **عن ابن عباس قال لما نزلت ھذہ الایة خرج رسول اللہ ﷺ حتی صعد الصفا** ...... وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ (۲) قسم کی روایات میں کوہ صفا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور ان روایات کی کثرت ہے، چنانچہ مثلاً دیکھئے: بخاری، کتاب التفسیر/ باب قولہ وانذر ...... عن ابی ہریرة، ایضاً کتاب الوصایا، **باب ھل یدخل النساء والولد فی الاقارب، عن ابی ھریرة**۔ ایضاً کتاب المناقب/ باب من انتسب ...... عن ابن عباس۔ نیز ایضاً عن ابی ہریرة۔ مسلم کتاب الایمان/ باب من مات علی الکفر ...... ولا تنفعہ قرابة المقربین، عن ابی ہریرة۔ ایضاً عن قبیصة بن المخارق و زہیر بن عمرو۔ ایضاً، کتاب الایمان/ باب فی قولہ تعالی وانذر ...... عن ابی ہریرة۔ ترمذی/ ابواب التفسیر الشعراء ...... عن ابی ہریرة۔ ایضاً عن عائشہ رضی اللہ عنہا۔ ایضاً عن قسامہ بن زہیر قال لقی الاشعری۔ نسائی

o\Alsera

کتاب الوصایا/ باب اذا اوصی لعشیرتہ الاقربین عن ابی ہریرۃ۔ ایضاً عن موسیٰ بن طلحہ۔ ایضاً عن ابی ہریرۃ۔ ایضاً (عن ابی ہریرۃ) ایضاً (عن عائشہ) نیز مسند احمد (روایات عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ) وغیرہ وغیرہ۔

۱۴۹/ ۱۔ الحجر: ۹۴

۱۴۹/ ۲۔ الشعراء: ۲۱۴، ۲۱۵

۱۴۹/ ۳۔ الحجر: ۸۹

۱۵۰۔ ابن اسحاق/ ص ۱۴۹، ۱۵۰۔ (محمد ابن اسحاق نے دو دعوتوں کا ذکر کیا ہے) جس میں بنو عبدالمطلب کے جمع ہونے کا ذکر ہے۔ ابن الاثیر کے مطابق دونوں دعوتوں میں سے ایک دعوت میں نبی ﷺ نے فرمایا تھا ''کسی قوم کا رہبر اپنی قوم سے جھوٹ نہیں بول سکتا اور اللہ وہی ہے جو یکتا معبود ہے اور جس کا ثانی نہیں ہے اس کا بھیجا ہوا رسول ہوں، جو تمہاری طرف خاص طور پر اور بنی نوع انسان کی طرف عام طور پر بھیجا گیا ہوں۔ واللہ ایک دن تم اسی طرح مر جاؤ گے جس طرح روزمرہ زندگی میں سو جاتے ہو اور پھر مرنے کے بعد زندہ ہو جاؤ گے جس طرح روزمرہ زندگی میں نیند سے بیدار ہو جاتے ہو، اور جو کچھ تم نے زندگی میں کیا ہے اس کا تم سے حساب لیا جائے گا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے جنت مقدر ہوگی، یا ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ۔ (ابن الاثیر/ ج ۱) ابن اسحاق کے مطابق دوسری مرتبہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اے بنی عبدالمطلب مجھے کسی ایسے عرب جوان کے بارے میں علم نہیں جو اپنی قوم کے پاس میری لائی ہوئی دعوت سے بہتر لائحہ عمل لایا ہو۔ میں تمہارے لئے دنیا و آخرت میں کامیابی کے حصول کا پروگرام لایا ہوں۔ (ابن اسحاق/ ص ۱۵۰)

۱۵۱۔ دیکھئے: تاریخ الیعقوبی/ ج ۲، ص ۲۷۔

۱۵۱/ ۱۔ کتاب الایمان، باب بیان انہ من مات فی الکفر ...... عن قبیصہ وزہیر بن عمرو

۱۵۲۔ آنحضرت ﷺ نے جن قبائل و بطون کو پکارا ان میں معشر قریش کے عنوان سے بنی کعب بن لوئی، بنی عبد شمس، بنی عبد مناف، بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب (مسلم/ کتاب الایمان) بنی قصیٰ (ترمذی/ ابواب التفسیر) مذکور ہیں۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ قبائل و بطون کے ساتھ ساتھ مختلف روایات میں براہ راست مخاطب، انذار و انتباہ میں عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا، فاطمہ بنت محمد (ﷺ) رضی اللہ عنہا (بخاری/ کتاب المناقب) اور ام الزبیر بن العوام (ایضاً) بھی شامل ہیں۔ نیز انذار و انتباہ کے مرکزی جملے اسی مناسبت سے وارد ہوئے ہیں: انی نذیر، انقذوا انفسکم من النار، انقذی نفسک من النار، اشتروا انفسکم لا اغنی من اللہ شیئا، فانی لا املک لکم من اللہ شیئا، ان لا املک لکم من اللہ شیئا (وغیرہ)) علاوہ ازیں عمومی و خصوصی خطابات میں جناب عباس، صفیہ، اور حضرت فاطمہ وغیرہ کو مخاطب کرنے کے ساتھ ساتھ بار بار یہ معنی خیز جملے بھی ہیں سلونی من مالی ما شئتم (میرے دنیاوی مال و متاع میں تم جو چاہو مانگ لو) مسلم (عن عائشہ)۔ یہ جملے نہ صرف یہ کہ ہادیٔ برحق اور رسول اعظم ﷺ کی انتہائی بے لوثی و بے غرضی کو ثابت کرتے ہیں بلکہ آپ ﷺ کی ذمہ دارانہ گفتگو اور معاشرے میں ذمے دارانہ حیثیت کو بھی ثابت کرتے ہیں۔ اور دعوت و تبلیغ کے اس مشن کو گذشتہ تمام انبیاء و رسول کے بے لوث مشن سے ہم آہنگ فرما

دیتے ہیں جسے قرآن جگہ بہ جگہ "وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العالمین (الشعراء: ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰) کے الفاظ میں موکد کرتا ہے۔

۱۵۳۔ اصحاب سیر نے ایسے متعدد واقعات نقل کئے ہیں۔ چنانچہ مثلاً سیرت ابن اسحاق میں حضرت ابن عباس کے حوالے سے جو روایت نقل کی ہے اس کے مطابق عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، نضر بن حارث، ابوجہل وغیرہ ۱۴/۱۵ سرداران قریش نے ایک دن بعد مغرب حرم کعبہ میں جمع ہو کر ایک دوسرے سے کہا کہ "ہمیں چاہئے کہ ہم محمد (ﷺ) کو بلائیں اور ان سے بات کریں اور اس کے بعد اگر ہم جھگڑا کریں تو معذور سمجھے جائیں گے، چنانچہ انہوں نے حضور (ﷺ) کو پیغام بھیجا، آنحضور اسی وقت جلدی سے تشریف لائے، کیونکہ آپ کا گمان تھا کہ شاید مشرکین آپ ﷺ کے دین کے بارے میں معلومات چاہتے ہیں، اور آپ کی یہ انتہائی خواہش تھی کہ مشرکین راہ راست پر آجائیں چنانچہ آپ ان کے پاس بیٹھ گئے۔ مشرکین نے پہلے تو شکوہ شکایت سے کام لیا اور پھر اپنے تئیں آپ ﷺ کو یہ پیش کش کی کہ اگر آپ کی غرض مال کا حصول ہے، یا بڑائی کے طلب گار ہیں، یا بادشاہی مطلوب ہے یا جن کا سایہ ہے تو ہم سب کچھ دینے، ماننے اور علاج کے لئے تیار ہیں۔ اس کے جواب میں آنحضور ﷺ نے فرمایا "میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہتے ہو! میں جو پیغام لایا ہوں اس سے میرا مقصود طلب مال اور حصول جاہ اور بادشاہی نہیں بلکہ اللہ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے مجھ پر کتاب نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں بشارت دوں اور خبردار کروں" مشرکین نے اس کے بعد آنحضرت ﷺ سے مختلف مطالبات اور معجزات طلب کئے اس پر بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میں ان کاموں کے لئے تمہارے پاس نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو تمہارے پاس صرف وہ پیغام لایا ہوں کہ اگر تم اس کو قبول کرلو تو تمہارے لئے دنیا و آخرت میں خوش بختی ہے اور اگر تم اسے رد کرتے ہو تو میں اللہ کے حکم کا صبر کے ساتھ انتظار کرتا رہوں گا" مشرکین نے اس کے علاوہ بھی بہت سے نازیبا مطالبات کئے اور آخر میں کہنے لگے "اے محمد (ﷺ) ہم نے آپ کے سامنے معذرت پیش کردی ہے، بخدا ہم آپ ﷺ کو اور آپ کی ان کارروائیوں کو جو آپ ہمارے درمیان کر رہے ہیں یونہی نہیں چھوڑیں گے، جب تک کہ ہم آپ کو ختم نہ کردیں یا آپ ﷺ ہمیں ختم نہ کردیں گے"۔ (ابن اسحاق/ص ۲۰۸ تا ۲۱۰۔ ملخصا)۔

۱۵۴۔ اس سلسلے میں عتبہ بن ربیعہ کا ایک دن خانہ کعبہ میں موجود گروہ قریش سے یہ کہنا کہ کیا میں محمد (ﷺ) کے پاس جاکر ان سے بات نہ کروں اور ان کے سامنے کچھ تجویزیں پیش کروں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان میں سے کسی تجویز کو قبول کرلیں اور وہ تجویز ہمارے لئے بھی قابل قبول ہو اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آجائیں"۔ قریش نے بخوشی اجازت دے دی اور کہا کہ ضرور جاکر ان سے بات کرو۔ عتبہ اٹھا اور آنحضور ﷺ کی خدمت میں آکر بہت کچھ کہا سنا جس میں لالچ، مطالبہ، پیش کش بھی شامل تھی۔ جب وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگیا تو آپ نے عتبہ سے فرمایا اچھا اب میری بات غور سے سنو اس کے بعد آپ ﷺ نے سورہ حم السجدہ کی تلاوت فرمائی۔ عتبہ دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے زمین پر ٹیکے ہوئے غور سے سنتا رہا۔ آپ نے فرمایا "اے ابوالولید آپ نے جو سنا وہ تو سن ہی لیا اب آپ جانیں اور آپ کا کام"۔ گروہ قریش کے پاس جاکر جو رپورٹ دی وہ ان کے لئے حیران کن تھی۔ وہ بولے اے ابوالولید خدا کی قسم اس کی زبان کا جادو تم پر بھی چل گیا ہے۔ (ابن اسحاق/ص ۲۱۸، ۲۱۹)

Alsera

١٥٥۔ابن ہشام/ ج١،ص٣١٢۔

١٥٦۔ابن سعد/ ج١،ص٢٠٢۔

١٥٧۔ایضاً

١٥٨۔ایضاً (ان ہذالشئ یراد)۔قرآن میں سورہ ص کی چھٹی آیت کا حصہ ہے۔سورہ ص کی ابتدائی چھ آیات کفار ومشرکین سے آنحضورؐ کے مکالمے، ان کے طرزِ عمل اور حضور ﷺ کے ایک اللہ کے مطالبے پر ان کی حیرانگی پر مشتمل روداد ہے ص والقرآن ذی الذکر O بل الذین کفروا فی عزۃ و شقاق O کم اھلکنا من قبلھم من قرن فنادوا ولات حین مناص O وعجبوا ان جاء ھم منذر منھم وقال الکافرون ھذا ساحر کذاب O اجعل الالھۃ الھا واحداً ان ھذا لشئ عجاب O وانطلق الملا منھم ان امشوا واصبروا علیٰ الھتکم ان ھذا لشئ یراد O

١٥٩۔جناب ابوطالب کی فکر وتشویش کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں ایک روز رات کو ابوطالب اور آپ کے دیگر چچا آپ ﷺ کے گھر پہنچے تو آپ کو موجود نہ پایا۔یہ بہت فکر انگیز بات تھی۔ آنجناب نے بنوہاشم اور بنومطلب کے جوانوں کو بلا کر جمع کیا اور یہ کہا کہ سب لوگ ایک ایک تیز دھار آلے سے مسلح ہو جائیں اور میرے پیچھے پیچھے مسجد حرام چلیں اور اکابر قریش کے ساتھ بیٹھ جائیں، جن میں ابوجہل بھی ہوگا، کیونکہ یہ اسی کی شرارت ہوسکتی ہے، اور اگر محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا گیا تو نوجوانوں نے کہا کہ ہم لوگ حملہ کر دیں گے، اتنے میں زید بن حارثہ ادھر آنکلے، ابوطالب نے ان سے پوچھا کہ میرے بھتیجے کی کچھ خبر ہے؟ انہوں نے کہا ہاں ابھی میں انہی کے ساتھ تھا۔ابوطالب کہنے لگے میں جب تک ان کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی نہ کر لوں گھر نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ حضرت زید بہت تیزی سے واپس گئے اور سید عالم ﷺ کو یہ خبر پہنچائی، جو اس وقت صفا سے ملحق دار ارقم میں تشریف فرما دوسرے صحابہ سے محو گفتگو تھے۔چنانچہ آنحضور ﷺ فوراً ہی حرم میں تشریف لے آئے۔ابوطالب نے دیکھتے ہی پوچھا بھتیجے کہاں تھے؟ خیریت تو ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں! ابوطالب نے کہا گھر چلئے۔اگلی صبح ہوئی تو جناب ابوطالب حضور ﷺ کا ہاتھ تھام کر قریش کی مجلس میں آئے، ان کے ساتھ بنوہاشم، بنومطلب کے مسلح نوجوان بھی تھے۔ابوطالب قریش کے لوگوں سے کہنے لگے تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کیا سوچا تھا؟ وہ بولے نہیں، تب انہیں وہ بات بتائی اور نوجوانوں سے کہا کہ ذرا انہیں دکھا تمہارے ہاتھوں میں کیا ہے، انہوں نے دکھا دیا کہ سب کے ہاتھوں میں تیز دھار دار آلہ تھا۔ابوطالب نے کہا کہ اگر تم نے خدانخواستہ بھتیجے کو قتل کر دیا ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی باقی نہ بچتا۔بلکہ ہم دونوں فریق لڑتے لڑتے فنا ہو جاتے۔اس وقت دوسرے لوگوں پر جو ہیبت طاری ہوئی وہ تو تھی ہی، سب سے زیادہ دیکھنے والی چیز تو ابوجہل کی مرعوبیت تھی۔(ابن سعد/ ج١،ص٢٠٢)۔

١٦٠۔تفصیل کے لئے: ابن اسحاق/ص٢٠٦، ٢٠٧۔

١٦١۔تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ایضاً/ص٢٣٦۔

١٦٢۔ایضاً/ص٢٣٧۔

١٦٣۔ایضاً/ص١٦١۔

۱۶۴۔ ابن سید الناس/ عیون الاثر/ ج ۱، ص ۱۲۶، ۱۲۷۔

۱۶۵۔ مفصل بحث اور تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مقالہ "شعب ابی طالب"۔ (نقوش رسول نمبر/ ج ۹/ شمارہ ۱۳۰/ جنوری ۱۹۸۴ء/ ص ۲۶۰ تا ۲۶۸)۔

۱۶۶۔ ابن اسحاق نے حضرت صفیہ بن عبدالمطلب کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں سے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔ خبردار قریش کو میری طرف سے کون یہ بات پہنچانے والا ہے کہ ہمارے درمیان کیا معاملہ رونما ہوا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہماری بات مقدم ہے اور ہمارے لئے جنگ کی آگ غداری کرکے نہیں بھڑکائی جا سکتی۔ جب ہم ہبہ کرتے ہیں تو بہت زیادہ عطا کرتے ہیں اور جب آسانی کا مطالبہ کیا جائے تو ہم وہ بھی عطا کرتے ہیں۔ جملہ مناقب خیر ہم میں موجود ہیں اور بعض امور ذلت ومنقصت اور عار کا باعث ہوتے ہیں۔ ہم اللہ کے فیصلے کو صبر کے ساتھ برداشت کریں گے، یہاں تک کہ ہمارا پروردگار ہمارے لئے واضح کردے کہ کہاں جا کر ٹھہرنا ہے (ابن اسحاق/ السیرۃ/ ص ۱۶۲) جناب ابوطالب کے اشعار کا منتخب حصہ اور ترجمہ یہ ہے۔ خبردار تم دونوں میری طرف سے بنی لوئی کو یہ پیغام پہنچا دو جو حقیقت پر مبنی ہے حالانکہ پیغام بھیجنے والے کا پیغام فائدہ مند ثابت نہیں ہوگا۔ یہ پیغام ہمارے قریبی چچا کے بیٹوں، بنی تیم اور بالخصوص ہمارے بھائیوں بنی عبد شمس اور بنی نوفل کے لئے ہے۔ کیا تم ہمارے خلاف ایسی قوم کی مدد کرتے ہو اور گمراہوں اور جاہلوں کے ہتھکنڈوں میں آچکے ہو! جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا ہے اور بنی ہاشم کی پیشانیوں کو ذلت کے ساتھ جھکا دیا ہے۔ رب ہدیٰ کی قسم تم جھوٹ کہتے ہو مکہ میں اور رکن عتیق جسے بوسہ دیا جاتا ہے اس کے پاس ان کے گلے کاٹے جائیں گے اور خون بہے گا۔ اگر تم محمد (ﷺ) کو قتل کرنا چاہتے ہو تو سب اکٹھا ہو کر ضرورت سے زیادہ کوشش کرتے رہو۔ تمہاری کوشش بے فائدہ ثابت ہوگی۔ (ایضاً/ ص ۱۶۴)۔

۱۶۷۔ ایضاً/ ص ۱۶۰ تا ۱۶۳۔

۱۶۸۔ ایضاً/ ص ۱۶۷۔

۱۶۹۔ الطبری/ الامام ابی جعفر محمد بن جریر/ تاریخ الامم والملوک/ منشورات مکتبہ اروميہ/ مطبعۃ الاستقامۃ بالقاہرہ، ۱۹۳۹ء، ۱۳۵۸ھ/ ج ۲، ص ۷۹۔ اس سے پہلے بھی طبری نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ: **رسول اللہ ﷺ فی کل ذلک یدعو قومہ سراً و جھراً آناء اللیل و آناء النہار و الوحی علیہ من اللہ متتابع بأمرہ ونہیہ من ناصبۃ العداوۃ الحجج لرسول اللہ ﷺ علی من خالفہ** (ایضاً/ ص ۷۴)

۱۷۰۔ ابن اسحاق کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے "قاسم" چوپائے کی سواری اور اچھی نسل کی اونٹنی پر سیر کرنے کے قابل ہو چکے تھے، جب وہ اللہ کو پیارے ہو گئے تو عمرو بن عاص نے کہا کہ محمد (ﷺ) کی نسل ختم ہو چکی ہے اب وہ ابتر ہے اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیات نازل فرمائیں: **انا اعطینٰک الکوثر O فصل لربک وانحر O ان شانئک ھو الابتر O** (الکوثر: ۱ تا ۳) سیرۃ ابن اسحاق/ ص ۲۶۲۔

۱۷۱۔ مکہ اور طائف حجاز کے مشہور (جڑواں) شہر ہیں۔ قرآن نے بھی دونوں شہروں مکہ اور طائف کو ایک قریتین (زخرف: ۳۱) سے ہی تعبیر کیا ہے۔ مکہ مکرمہ سے جنوب مشرق میں تقریباً ۶۵ میل کے فاصلے پر طائف

o\Alsera

واقع ہے جہاں بڑے بڑے امراء اور ارباب اثر و رسوخ رہتے تھے۔ یہ بڑا سرسبز و شاداب علاقہ اور سرد مقام تھا جہاں قریش کے بڑے لوگ گرمیاں گزارنے جاتے تھے، نیز ان کی وہاں جائیدادیں باغات وغیرہ تھے۔ واٹ نے لکھا ہے کہ طائف ایک تجارتی مرکز تھا اس کے یمن سے گہرے تعلقات تھے۔ طائف کے باشندے بنوثقیف تھے جو دور دراز علاقوں سے اپنی تجارتی سرگرمیاں قریش کے اشتراک سے کرتے تھے۔ بطور خاص بنو ہاشم اور بنوعبدشمس سے طائف والوں کے گہرے تعلقات تھے نیز بنومخزوم سے بھی گہرے مالی معاملات تھے۔ مجموعی طور پر ثقیف سے زیادہ طاقتور قریش تھے (ص۱۳۸) وہ آگے لکھتا ہے کہ طائف میں مرکزی سیاسی دو گروہ تھے ایک بنومالک اور دوسرے احلاف، احلاف پرانے آباد کار اور وہاں کی دیوی (لات) کے مجاور و محافظ تھے۔ دوسرے بنومالک ہوازن سے وابستہ تھے جو آس پاس مقتدرانہ حیثیت رکھتے تھے۔ آنحضور ﷺ نے وہاں جن سرداروں تک رسائی حاصل کی ان میں سے بطور خاص (عمرو بن عمیر بن عوف کے لڑکوں عبدیالیل، مسعود اور حبیب) عبدیالیل اور اس کے بھائی تھے۔ جن کا تعلق عمرو بن عمیر کی شاخ سے تھا جو احلاف میں سے تھے اور قریش کے لئے زیادہ پسندیدہ (محمد ایٹ مکہ/ص۱۳۹) طائف کا تبلیغی سفر حضور ﷺ نے شوال ۱۰ نبوی (جون، ۶۱۹ء) میں اختیار فرمایا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ کے ہم سفر تھے۔ آنحضور ﷺ راستہ کے قبیلوں میں وعظ فرماتے ہوئے اور منزل بہ منزل (عام روایات کے مطابق) پیدل چلتے ہوئے طائف کے مذکورہ سرداروں کے پاس پہنچے، ان تک پیغام خداوندی پہنچایا، نیز طائف میں آنحضور ﷺ نے دس روز قیام فرمایا۔ (السیرۃ الحلبیہ/۱۹۶۲ء/ ج۱،ص۳۹۱)

۱۷۲۔ آپ ﷺ کے غم و اندوہ کا اندازہ اس دعا سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو سرورکونین نے مالک الملک ذوالجلال والاکرام کی بارگاہ میں پیش فرمائی: بار الٰہ میں اپنی قوت کی کمی، اپنی بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلے میں اپنی بے بسی کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں۔ نیز فرمایا: میں تیرے ہی نور و جمال کی پناہ طلب کرتا ہوں، مجھے تو تیری رضا مندی اور خوشنودی کی طلب ہے، تیرے سوا کہیں سے کوئی قوت و طاقت نہیں مل سکتی۔ (ایضاً/ص۳۸۵) بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (بخاری/کتاب بدأ الخلق اذا قال احدکم آمین والملائکۃ فی السماء آمین) کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ پر احد کے دن سے زیادہ شدید اور سخت دن بھی گزرا ہے تو آپ نے فرمایا: **لقد لقیک من قومک ما لقیت و کان اشد ما لقیت منھم یوم العقبۃ اذا عرضت نفسی علی ابن عبد یالیل ابن عبد کلال فلم یجبنی الی ما اردت** "تیری قوم سے مجھے دکھ پہنچے وہ تو پہنچے ہی ہیں مگر عقبہ کے روز (طائف میں) مجھ پر جو گزری وہ اس سے شدید ترین تھی، جب کہ میں نے ابن عبدیالیل کے روبرو اپنے آپ کو پیش کیا، مگر اس نے میری خواہش کے مطابق جواب نہ دیا"۔

۱۷۳۔ چنانچہ اثنائے راہ میں ہی جب پہاڑوں کے فرشتے نے آپ ﷺ کو سلام کر کے عرض کیا کہ آپ ﷺ فرمائیں تو میں دونوں طرف کے پہاڑوں کو (ان لوگوں کی آبادی پر) الٹ دوں؟ اس وقت رحمۃ للعالمین نے فرمایا: **بل ارجوا ان یخرج اللہ عز و جل من اصلابھم من یعبداللہ عز و جل وحدہ ولایشرک بہ شیئا** "نہیں بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو اللہ وحدہ لا شریک کی بندگی کریں گے"۔ آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی آپ کے عزم و ہمت اور مستقبل کے لئے بھرپور امید کا

اظہار بھی تھا، اورشدید مصائب وآلام، درد وکرب اور آزمائش میں انتہائی صبر وضبط، تحمل وبرداشت، رحم وکرم، عفو ودرگزر اور عالی ظرفی کا بے مثال نمونہ بھی۔

۱۷۴۔مولانا سید مناظر احسن گیلانی / النبی الخاتم ﷺ / احسن برادرز، لاہور، ۱۹۶۴ء/ ص ۸۹، ۹۰

۱۷۵۔ایضاً / ص ۸۹۔

۱۷۶۔ایضاً / ص ۹۷۔

۱۷۷۔مولانا مناظر احسن گیلانی نے جنوں کی بطن نخلہ میں آمد کے عنوان ''جنوں سے بیعت و ملاقات'' قائم کیا ہے اور اسے تسخیری آثار (برزخی تسخیر) میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قبل اس کے کہ دیہدوں کی طرف تبلیغی مہم روانہ ہو، نادیدوں کا یہ گروہ ان ہی نامحسوس علاقوں کی طرف تبلیغی مہم کے پہلے دستے کی حیثیت سے روانہ ہوگیا۔(ایضاً / ص ۱۰۱)۔

۱۷۸۔الاحقاف آیت ۲۹ تا ۳۱۔سورۂ احقاف مکیہ ہے جس کا نزول ۱۰ نبوی کے اواخر یا ۱۱ نبوی کے اوائل میں ہوا۔سورہ احقاف کا زمانۂ نزول آنحضور ﷺ کے سفر طائف سے متصل ہے اور قرآن کی تلاوت کے دوران جنوں کی آمد وسماعت کا واقعہ حدیث وسیرت کی متفق علیہ روایات کی رو سے اس وقت پیش آیا تھا جب نبی ﷺ طائف سے مکہ معظمہ کی طرف پلٹتے ہوئے نخلہ کے مقام پر ٹھہرے تھے (تفہیم القرآن/ ج ۴، ص ۵۹۶) سورہ احقاف آیت ۲۹ تا ۳۱ میں جنوں کی بطن نخلہ میں دوران نماز تلاوت قرآن کی سماعت کے حوالے سے تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ اس موقع پر جن حضور ﷺ کے سامنے نہیں آئے تھے، نہ آپ نے ان کی آمد کو محسوس فرمایا تھا بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو ان کے آنے اور قرآن سننے کی خبر دی۔یہ مقام جہاں یہ واقعہ پیش آیا یا تو الزیمہ تھا یا السیل الکبیر، کیونکہ یہ دونوں مقام وادی نخلہ میں واقع ہیں (ایضاً / ص ۱۱۸) معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جنوں کے پے درپے وفود نبی ﷺ کے پاس حاضر ہونے لگے، اس بارے میں روایات منقول ہیں کہ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں کم از کم چھ وفد آئے تھے (ایضاً / ۶۱۹)

۱۷۸/ا۔الحلبی، السیرۃ، المکتبۃ التجاریہ قاہرہ، مصر، ۱۹۶۲ء، ج ۲، ص ۲

۱۷۹۔ابن ہشام نے عرض رسول اللہ ﷺ نفسہ علی القبائل کے زیر عنوان بہت کچھ تفصیلات لکھی ہیں اور بدء الاسلام الانصار کے ضمن میں خزرجیوں کے ان چھ آدمیوں کے نام نقل کئے ہیں اور بعد میں بیعت عقبہ اولیٰ وثانیہ کی متعلقہ تمام تفصیلات لکھی ہیں، تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ایضاً / ص ۶۳ تا ۱۱۰۔

۱۸۰۔مورخین، اصحاب سیر اور اہل تقویم نے وقوع معراج کے تعیین زمانہ میں اختلاف کرتے ہوئے اسے ہجرت مدینہ سے ۵ سال، ۴ سال، ۳ سال، ۲ سال، / ایک سال (یا ۲۰ ماہ، ۱۸ ماہ، ۱۷ ماہ، ۱۶ ماہ، ۱۵ ماہ، ۱۴ ماہ، ۱۳ ماہ، بلکہ ۸ ماہ اور ابو الربیع سالم کے مطابق ۶ ماہ) قبل کا واقعہ قرار دیا ہے۔ان مختلف النوع اقوال کے مع حوالہ تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: ذبیح ترمذی/ سید اسماعیل رضا/ حیات نبوی کی صحیح جنتری/ الاعوان پرنٹر ہری پور، ۱۹۹۱ء/ ص ۱۷۲، ۱۷۳، تاہم جیسا کہ مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے (رحمۃ للعالمین/ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۲ء/ ج ۳، ص ۱۳۰) لکھا ہے کہ اس واقعے کو تین سال قبل ہجرت سے زیادہ کا تاخر نہیں دے سکتے، لہٰذا

واقعہ معراج کا متوقع زمانہ ۱۰ نبوت/ ۶۲۰ء یا ۱۱ نبوت/ ۶۲۱ء یا ۱۲ نبوت/ ۶۲۲ء قرار دیا جانا مناسب ہے، ان تینوں سنین کا تقویمی انطباق اور ہجری، عیسوی اور مکی مدنی سنین کا تقابلی خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) ۲۷ رجب (۳ ق ھ) ۷ مارچ ۶۲۰ء (ضیاء الدین لاہوری/ جوہر تقویم/ ص ۴۰)۔

(۲) ۲۷ رجب (۲ ق ھ) ۲۴ فروری ۶۲۱ء (ایضاً)۔

(۳) ۲۷ رجب (۱ ق ھ) ۱۴ فروری ۶۲۲ء (ایضاً) یہی مصنف تقویم عہد نبوی کے حصہ میں قمری شمسی تقویم کا تقابلی مطالعہ (ص ۲۶۵) کے تحت سنین بالا کی عیسوی تعیین بالترتیب ۱۰ مارچ ۶۲۰ء، ۲۶ مارچ ۶۲۱ء اور ۱۶ فروری ۶۲۲ء تحریر فرماتے ہیں (ص ۲۷۴، ۲۷۵) جب کہ جناب علی محمد خاں (مختصر دائمی تقدیم/ اسلامک پبلی کیشنز لمٹیڈ، لاہور ۱۹۸۳ء/ چند خاص تاریخیں/ ص ۱۹۵) کے زیر عنوان معراج، ۲۷ رجب ۵۱ میلاد (۳ ق ھ) کی مطابقت ۸ مارچ ۶۲۰ء اور ۲۷ رجب میلاد ۵۲ء (۲ ق ھ) کی مطابقت ۲۵ فروری ۶۲۱ء قرار دے کر لکھتے ہیں کہ علامہ قاضی سلیمان منصور پوری نے بحوالہ ابن عبدالبر ۲۷ رجب ۵۲ میلاد کو صحیح بتایا ہے (دیکھئے علی محمد خاں/ ص ۲۰۸) جب کہ ذبیح ترمذی صاحب نے الگ الگ جدول بنا کر مکی مدنی تقویم اور عیسوی وہجری کے اندراج کے ساتھ تاریخ کو واضح کیا ہے۔ چنانچہ ۲۷ رجب ۱ ق ھ کے مطابقت بروز پیر ۱۸ فروری ۶۲۲ء کی ہے (ملاحظہ ہو: ص ۱۷۶)

۱۸۱۔ تاریخی اعتبار سے گویا یہ وہ زمانہ ہے جب مدینہ طیبہ میں (چھ مدنی حضرات کے ذی الحجہ ۱۰ نبوی یعنی جولائی ۶۲۰ء میں قبول اسلام کے بعد) اسلام کی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری تھا، نیز ذی الحجہ ۱۱ نبوی (یعنی جولائی ۶۲۱ء میں) انصار مدینہ سے بیعت عقبہ اولی کے بعد اسلام مدینہ میں روز افزوں ترقی کر رہا تھا، یہاں تک کہ رجب ۱ ق ھ (فروری ۶۲۲ء) میں واقعہ معراج پیش آیا۔ جس کے ۵ ماہ بعد ذی الحجہ ۱۲ نبوی (جون ۶۲۱) میں بیعت عقبہ کبیرہ کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا جس نے ایک اور عظیم الشان واقعے کو جنم دیا، یعنی مکی مسلمانوں نے مدینہ منورہ ہجرت شروع کر دی، یہاں تک کہ سید الرسل فخر انبیاء علیہ التحیۃ والثنا بھی صرف ۳ ماہ بعد ہجرت فرما گئے۔ اس لئے مولانا قاضی سلیمان منصور پوری نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ واقعہ معراج کو ہجرت سے قریب ترین تعلق ہے۔ (ج ۳، ص ۱۴۰) علاوہ ازیں واقعہ معراج کو ایک سال قبل ہجرت تسلیم کرنا قرین صواب ہے (ابن الاثیر/ ج ۱، ص ۵۷۸)

۱۸۲۔ محمد رواس قلعہ جی/ تہذیب سیرۃ ابن ہشام/ النشر والتوزیع مکتبہ ربیع، حلب/ ج ۱، ص ۱۱۲۔

۱۸۳۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے: مودودی/ تفہیم القرآن/ تفسیر سورہ الاسراء۔

۱۸۴۔ السبا: ۲۸۔

۱۸۵۔ الرعد: ۷۔

۱۸۶۔ یٰسین: ۹۔

۱۸۷۔ زمر: ۶۴۔ الفرقان: ۶۳۔

۱۸۸۔ الفرقان: ۲۱۔

۱۸۹۔ مریم: ۹۷۔

۱۹۰۔ مریم: ۲۸۔ الاحقاف: ۱۲۔

۱۹۱۔ یٰسین: ۹۔

۱۹۲۔ النحل: ۱۰۸۔

۱۹۳۔ کل کذب الرسل فحق وعید (ق: ۱۷) کذلک کذب الذین من قبلھم (یونس: ۳۹)، وان یکذبوک فقد کذب الذین من قبلھم (فاطر: ۲۵)، وان یکذبوک فقد کذبت رسل من قبلک (فاطر: ۴)

۱۹۴۔ الحج: ۴۲۔ نیز الشعراء: ۱۰۵، ۱۲۳، ۱۴۱، ۱۶۰۔ القمر: ۹، ۱۸، ۲۳ وغیرہ

۱۹۴/۱۔ انعام: ۵

۱۹۴/۲۔ ق: ۵

۱۹۴/۳۔ النحل: ۱۱۳

۱۹۵۔ یٰسین: ۱۵۔ ابراہیم: ۱۰۔ المومنون: ۲۴۔ الشعراء: ۱۵۴۔ الفرقان: ۷، ۲۰۔

۱۹۶۔ الحاقۃ: ۴۰۔ یٰسین: ۶۹۔ انبیاء: ۵۔ الصافات: ۳۶۔ الطور: ۳۰۔

۱۹۷۔ القلم: ۲۔ الطور: ۲۹۔ التکویر: ۲۲۔ الحجر: ۶۔

۱۹۸۔ الانعام: ۷۔ یونس: ۲۔ القمر: ۲۔ المدثر: ۲۴۔ ص: ۴۔ الذاریات: ۵۲۔

۱۹۹۔ الحاقۃ: ۴۲۔ الطور: ۲۹۔

۲۰۰۔ حنفا حنیف کی جمع ہے، جس کے لفظی معنی ہیں سیدھا، اسلامی احکام پر عمل پیرا، ہر وہ شخص جو دین ابراہیمی پر قائم ہو۔ موحد۔ اصطلاحی طور پر عرب جاہلی معاشرے کے وہ افراد مراد ہیں جو آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی ادیان باطلہ سے متنفر تھے اور شرک، بت پرستی وغیرہ کو ترک کر کے دین حق اور دین ابراہیمی کے متلاشی تھے۔ T.P.HUGHES نے اپنی کتاب ''ڈکشنری آف اسلام'' (روپا پیپر بیک ایڈیشن، دہلی ۱۹۹۳ء) میں مجمع البحار کے حوالے سے حنیف کے تین معنی لکھے ہیں: (۱) اسلام کی طرف میلان رکھنے والا (۲) جو اپنے عقائد میں سخت پختہ ہو (۳) دین ابراہیمی کا متبع۔ نیز اس کے مطابق قرآن میں ۶ مقامات پر دین ابراہیمی کا ذکر ہے، چار جگہ عقائد میں سختی اور پختگی کا مفہوم ہے۔ نیز وہ لکھتا ہے کہ اس اصطلاح کو ابتدائی زمانہ اسلام میں بھی استعمال کیا گیا اور آنحضرت ﷺ سے پہلے بھی ان لوگوں کیلئے جو عرب جاہلیت کے متنازع عقائد اور کفر و بت پرستی کے ماحول میں تلاش حق کی جستجو کر رہے تھے، اور جس ماحول میں آپ ﷺ نے اپنے آپ کو ایک دینی نبی کی حیثیت سے پیش کیا، ان میں ورقہ اور زید بن عمرو تھے جن کو حنیف کہا جاتا تھا۔ ایک ایسا لفظ جس کے بنیادی معانی میں کسی چیز کے بارے میں جھکاؤ اور میلان ہو، اس لئے اس کے مفہوم میں کسی چیز کے بارے میں میلان یا (اس کے برعکس) انحراف شامل ہوگا۔ قرآنی آیات محولہ بالا کو تاریخی ترتیب میں رکھ کر دیکھا جائے تو آنحضور ﷺ نے اسے پہلے دین ابراہیمی کے لئے استعمال فرمایا، اور دین اسلام کے سچے سنجیدہ متبع کے معنی میں بعد میں استعمال کیا گیا (ص ۱۶۰ تا ۱۶۱) ابن اسحاق نے قریش سے جن حنفا کو شمار کیا ہے ان میں (۱) زید بن عمرو بن نفیل (۲) ورقہ بن نوفل بن اسد (۳) عثمان بن حویرث بن اسد اور (۴) عبید اللہ بن جحش بن رئاب شامل ہیں (ابن اسحاق/ص ۱۱۶)، مولانا شبلی

رحمہ اللہ نے بھی سیرت النبی (ج۱، ص۱۳۵) میں ان چار اشخاص کو مذہب حنفی کے زیر عنوان شامل کیا ہے۔ قریش مکہ کے علاوہ دوسرے قبائل وا ماکن میں بھی اکا دکا حنفی موجود تھے، مثلاً مولانا شبلی نے طائف کے رئیس اور مشہور شاعر امیہ بن ابی صلت کو حنفی کہا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں زبیر بن بکار کی سند سے لکھا ہے کہ امیہ نے زمانۂ جاہلیت میں آسمانی کتابیں پڑھی تھیں اور بت پرستی کو چھوڑ کر دین ابراہیمی اختیار کرلیا تھا۔ (ایضاً) بت پرستی سے توبہ کرنے والوں میں قیس بن ساعدہ اور قیس بن نشبہ بھی تھے (ایضاً/ ۱۳۶)۔ ایک اور جگہ مولانا شبلی نے موحدین کے زیر عنوان قس بن ساعدہ کو بھی دوسرے حنفاء کے ساتھ شمار کیا ہے۔ (ایضاً/ص۱۹۵) جدید العہد برطانوی مستشرق واٹ (W.M.WATT) نے اپنی کتاب محمد ایٹ مکہ (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۱۹۷۹ء) میں حنیف اور حنفاء کے بارے میں بہت کچھ قیل وقال کی ہے مگر تمام تر گفتگو مغالطہ آمیز اور جگہ جگہ تضادات وتکرار ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے وہ متن کتاب میں دینی و ذہنی پس منظر کے تحت جزو (ج) کا عنوان قائم کرتا ہے (ص۲۵) اور اسلامی تعلیمات پر عیسائی یہودی اثرات دکھانے کے لئے گفتگو کا آغاز قرآن سے کرتا ہے جو مسلمانوں کی نظر میں کلام الٰہی اور وحی والہام پر مبنی ہے۔ اس کے خیال میں قرآن مشرک وبت پرست عربوں کے عقائد و خیالات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے جن کی فضاؤں میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے ہم عصر افراد ذہنی نشو ونما سے گزرتے تھے۔ (ص۲۶) واٹ کے نزدیک عربوں کے موحدانہ خیالات یقیناً عیسائی یہودی اثرات کی بنا پر ہی پیدا ہوئے ہوں گے کیوں کہ عربوں کو عیسائیوں، یہودیوں کے زیر اثر آنے کے بہت سے مواقع موجود تھے۔ (تفصیل: ص۲۷، ۲۸) لیکن عربوں پر یہودیوں عیسائیوں کے علاوہ دوسرے موحدانہ گروہوں کے زیر اثر آنے کو بھی بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا (ایضاً) لہٰذا لفظ حنیف کی امکانی تعبیر میں بھی اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ تاہم وہاں کسی موحدانہ تحریک کے پائے جانے کا کوئی مضبوط ومعقول ثبوت نہیں ملتا۔ اور اگر اس قسم کی کوئی تحریک موجود ہوگی تو اس میں غرض و مفاد یا سیاست کی کوئی نہ کوئی کارفرمائی ضرور رہی ہوگی۔ جس طرح عثمان بن الحویرث کا معاملہ جو بازنطینی سلطنت کی پشت پناہی اور مدد سے مکہ کا مطلق فرمانروا بننا چاہتا تھا (ایضاً) البتہ حنفاء کے باب میں پائے جانے والے راویتی بیان میں بہر حال ایک گونہ صداقت ضرور پائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہاں کچھ لوگ ایک نئے مذہب اور عقیدے (Faith) کے متلاشی تھے نیز عرب کے مذہبی ماحول میں عموماً اور چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر مکہ میں خصوصاً متعدد سنجیدہ مزاج رکھنے والے ضرور ہوں گے جو خلا محسوس کرتے ہوئے، اپنی ذہنی تشنگی، جستجوئے باطن اور آسودگی قلب کے لئے (کسی نئے دین ودعوت کے) متمنی ہوں گے (ایضاً) بہر حال یہ متعین کرنا قدرے مشکل ہے کہ یہودی عیسائی اثرات کی اہمیت کیا ہے جب کہ بہت سی تفصیلات میں ہنوز اختلاف ونزاع موجود ہے (ص۲۹) بہر حال مختصر یہ کہ جب قرآن پیغمبر اسلام پر نازل ہو رہا تھا تو اس قسم کے متفرق خیالات و نظریات ہوا میں کہیں موجود تھے، جس سے گویا آپ ﷺ اور آپ کے مشن کی آمد پر ماحول تیار ہو رہا تھا۔ (ص۲۹) متن کتاب کے بعد آگے چل کر واٹ ضمیمہ ب، ص۱۵۸ تا ۱۶۱ کے تحت عرب میں موحدانہ خیالات اور یہودی عیسائی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اسے محض مفروضہ قرار دیتا ہے۔ یہ مفروضہ اس کے نزدیک بے بنیاد ہے، اور موحدانہ خیالات، ایک مبہم توحید سے زیادہ کچھ نہیں تھے جس کے نہ اپنے خد وخال واضح تھے، نہ متعین افعال

Alsera

عبادت تھے اور نہ شرک وبت پرستی سے فرق وامتیاز ممکن تھا (ص۱۵۸)۔ کتاب کا ضمیمہ (ج) حنیف/ حنفا کے لئے مختص ہے (ص۱۶۲ تا ۱۶۴) آغاز مقالے میں ابن اسحاق کے حوالے سے چار آدمیوں اور ابن قتیبہ کے حوالے سے نصف درجن ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کے لئے حنیفیت کی اصطلاح کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ ان حوالوں سے ہم کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ عرب میں موحدین کا ایک ایسا گروہ موجود تھا جو نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی (ص۱۶۲) واٹ کے مطابق اس موضوع پر اسپرینگر سے لے کر آج تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے جس کا خلاصہ بھی ممکن نہیں، لہٰذا گفتگو کو صرف چند نکات تک محدود رکھنا ہوگا (ایضاً) واٹ کے بقول قرآن میں لفظ حنیفیت کا استعمال کافی آغاز فراہم کرتا ہے (ایضاً) لیکن واٹ قرآن کو ایک عام کتاب کی طرح خیال کرتے ہوئے ترتیب نزول، اور ترتیب تلاوت میں امتیاز کئے بغیر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''قرآنی تعلیمات کا (حنیفیت سے متعلق) بیان ابتدائی مدنی دور میں اس وقت منظر عام پر آیا جب کہ یہودیوں سے پیغمبر اسلام کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے (ایضاً) (جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حنیفیت، حنفا اور دین حنیف کے بارے میں ابتدائی حوالے مکی سورتوں میں بھی (مثلاً الانعام:۷۹، ۱۶۱۔ النحل: ۱۲۰، ۱۲۳۔ الروم:۳۱۔ یونس:۱۰۵) پائے جاتے ہیں اور مدنی سورتوں میں بھی (بقرہ:۱۳۵۔ آل عمران:۶۷، ۹۵۔ نساء:۱۲۵۔ الحج:۳۱۔ البینۃ:۵) پائے جاتے ہیں) آگے چل کر وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ Hanifs کے تمام حوالے جو ابتدائی مآخذ میں ہیں نیز قرآن میں پائے جانے والے بیانات کے باوجود، حنفاء میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں تھا جس نے اپنے آپ کو حنیف کہا ہو یا یہ کہے کہ وہ حنیفیت کی تلاش میں تھا (ص۱۶۲) واٹ کی یہ بات بھی درست نہیں۔ حنفا میں کم از کم ایک یعنی زید بن عمرو بن نفیل نے اپنے آپ کو حنیف، متبع دین ابراہیمی خود بھی قرار دیا اور وہ خود بھی حنیفیت کی تلاش میں سرگرداں رہا (اس کی پوری تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ابن اسحاق/ص۱۱۶ تا ۱۲۰ نیز اس کا انگریزی ترجمہ از A.Guillenme مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۱۹۹۰ء/ص۹۸ تا ۱۰۳)، ابن ہشام کے مطابق زید بن عمرو کہا کرتا تھا: **یا معشر قریش والذی نفس زید بن عمرو بیدہ ما اصبح منکم احد علیٰ دین ابراھیم غیری** (ج۱، ص۲۴۰) نیز آگے لکھا ہے: **ثم خرج یطلب دین ابراھیم علیہ السلام و یسأل الرھبان والاحبار** ...... (ایضاً/ص۲۴۶) واٹ نے ضمیمہ (ج) میں لکھا ہے کہ عرب میں اس کے کافی شواہد موجود ہیں کہ حنیف کا استعمال آنحضور ﷺ سے پہلے بھی تھا (اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان مثالوں میں اصلیت کتنی ہے؟ (ص۱۶۲) پھر یہ نئی بات لکھتا ہے کہ یہ لفظ اصلاً (Nabateans) نبطیوں کی زبان سے ماخوذ ہے۔ ان کی زبان میں معنی کسی یونانی شامی عرب مذہب کی کسی شاخ کے متبع اور پیروکار کے تھے۔ بہر حال ماخوذ ہونے کی بات تو بعد کی ہے۔ اگر در حقیقت بالاتر نظریہ درست ہے تو ضروری نہیں کہ قبول کیا جائے (ایضاً/۱۶۲، ۱۶۳) اپنے ضمیمہ کا اختتام کرتے ہوئے واٹ رقم طراز ہے کہ سیرت محمد (ﷺ) کے باب میں نام نہاد حنفا (کے تذکرہ) کی طالب علموں کے نزدیک اہمیت زیادہ تر اس لئے ہے کہ وہ یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اس زمانے میں موحدانہ تصور پایا جاتا تھا (ص۱۶۴) اپنی اس گفتگو سے واٹ شاید یہ تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے کہ اپنی بعثت کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے تصور توحید پیش کر کے کوئی کمال نہیں کیا تھا۔ یہاں مولانا شبلی کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے کہ مصنفین یورپ کہتے ہیں کہ مذہب حج اور توحید

خالص کا رواج عام عرب میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اسلام کے ظہور پر اس قدر کیوں ہنگامہ برپا ہوا۔ (سیرت النبی/ ج۱، ص۱۳۶، ۱۳۷)

۲۰۱۔ زید کا نام ونسب یہ تھا۔ زید بن عمرو بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن عبداللہ بن قرط ابن رباح بن رواح بن کعب بن لوئی (ابن ہشام/ ج۱، ص۲۴۷) انہوں نے نہ یہودیت اختیار کی نہ عیسائیت اور اپنی قوم کا دین بھی نہیں اپنایا۔ بتوں، مردار، خون سے کنارہ کشی اختیار کی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے ممانعت کرتے اور بتوں کے نام پر ذبیحہ کھانے سے مجتنب رہتے تھے۔ (ایضاً/ ص۲۳۹، ۲۴۰) لات وعزیٰ اور ہبل کے انکاری تھے (ایضاً/ ص۲۴۱) صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے پہلے زید کو دیکھا تھا اور ان سے صحبت رہی تھی (شبلی/ سیرت/ ج۱، ص۱۳۵) ابن اسحاق کے ہاں جو روایت منقول ہے اس کے مطابق عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم زید کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے لئے مغفرت طلب کرو۔ اس لئے کہ وہ ایک امت کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا (ابن اسحاق/ ج۱، ص۱۲۰) مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے اصح السیر (مطبوعہ اصح المطابع کراچی) میں بطور حدیث نقل کیا ہے۔ **هو يبعث امة وحدة القيامة** (ص۵۸) زید کا قول تھا: **الهي الله ابراهيم وديني دين ابراهيم** (ایضاً) زید کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ وہ دین کا طالب تھا اور اسی تلاش وجستجو میں اسے موت آئی (ابن اسحاق/ ص۱۲۰)

۲۰۲۔ ابن اسحاق/ ص۱۱۶۔

۲۰۳۔ ایضاً/ ص۱۱۸۔

۲۰۴۔ ایضاً۔

۲۰۵۔ ایضاً۔

۲۰۶۔ دین ابراہیمی/ حنیفیت کی تلاش میں زید بن عمرو نے موصل، الجزیرہ، شام تک کا سفر کیا اور یہودی عیسائی علماء، احبار، رہبان سے معلوم کیا یہاں تک کہ بقول ابن ہشام سرزمین بلقا میں میفعہ کے راہب سے مل کر دین حنیفیہ، دین ابراہیم کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا تھا کہ وہ دین ناپید ہوگیا اور اس کے جاننے والے دنیا میں باقی نہیں رہے مگر ہاں ایک نبی ﷺ کی بعثت قریب ہے جس کا ظہور وہیں ہوگا جہاں سے تم آئے ہو۔ یہ اطلاع پاتے ہی زید نے فوراً مکہ کا رخ کیا، لیکن مکہ پہنچنے سے پہلے ہی لخم والوں نے انہیں قتل کردیا (ابن ہشام/ ج۱، ص۲۴۷)

۲۰۷۔ ورقہ خود بھی پہلے حنیف (یعنی زید بن عمرو کے نقش قدم پر چلنے والوں میں سے) تھے۔ مگر پھر زید کا سا طرز عمل نہ اپنا سکے اور نصرانی ہوگئے۔ زید کے قتل پر زبردست مرثیہ لکھا (ابن اسحاق نے چند اشعار نقل کئے ہیں: ص۱۱۹، ۱۲۰) واٹ نے بھی اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے ساتھ کتاب کے ضمیمے میں ورقہ کو حنفا میں شمار کیا ہے۔ (واٹ/ محمد ایٹ مکہ/ ص۱۶۳) واٹ نے بڑی تاکید کے ساتھ لکھا ہے کہ ورقہ کی طرف سے (حضور ﷺ کی) رسالت کی تصدیق بہت اہم ہے۔ اس نے یہ نکتہ سازی بھی کی ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کو اپنے اوپر زیادہ اعتماد نہیں تھا، اور آپ طبعاً متردد تھے (ص/ ۵۰، ۵۱) واٹ کا مفروضہ یہ بھی ہے کہ ورقہ سے حضور ﷺ کی متعدد ملاقاتوں میں بہت کچھ اخذ کر کے آپ نے اس کے خیالات کو ہی وحی کے طور پر پیش کردیا (ایضاً/ ص۵۲) واٹ کی

Alsera

یہ تمام توجیہات بے سروپا، تاریخی حقائق کے خلاف اور واقعات کے سیاق وسباق میں غلط ہیں۔

۲۰۸۔ بخاری کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ورقہ بن نوفل کا مفصل حوالہ ہے، اسے امام صاحب کیف کان بدء الوحی کے باب میں (تیسری حدیث) لائے ہیں (صحیح البخاری/ المطبعۃ السلطانیہ / داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۳ھ/ ج۱،ص۳،۴) نیز کتاب التفسیر، باب ماجاء فی فاتحۃ الکتاب کے تحت پوری حدیث (محض ایک دو لفظ کے رد وبدل کے ساتھ) نقل کی ہے (ایضاً / ج ۶،ص۲۱۴، ۲۱۵) اور کتاب التعبیر میں (باب التعبیر واول مابدی بہ رسول اللہ ﷺ (ایضاً / ج۹،ص۳۷، ۳۸) میں بھی نقل کی ہے۔(مولانا شبلی نے بھی سیرت النبی میں یہ حوالے نقل کئے ہیں (دیکھئے سیرت النبی/ ج۱،ص۲۰۳۔۲۰۶) تاہم مندرجات اور ورقہ بن نوفل کے حوالہ سے مولانا کے نقد ونظر میں جو تسامحات پائے جاتے ہیں ان پر بجائے خود تعقیب کی جاتی رہی ہے (مثلاً مولانا اسحاق کلکتوی نے مضمون لکھا جو مئی ۱۹۱۳ء کے الہلال میں شائع ہوا، مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے اصح السیر کے حاشیہ (ص۱۷ اور ۲۰) یا مثلاً مولانا شبیر احمد عثمانی نے (فضل الباری شرح اردو صحیح بخاری/ ادارہ علوم شرعیہ کراچی ۱۹۷۳ء) کئی باتوں میں ان پر تنقید کی ہے (ج۱،ص۱۷۲، ۱۷۵) وغیرہ اور حال میں شائع ہونے والی کتاب (ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی/ مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار/ دارالنوادر، لاہور ۲۰۰۵ء) میں باب پنجم، روایات صحیحہ پر تنقید (ص۱۳۸ تا ۱۴۷) کے زیر عنوان مفصل طور پر مولانا شبلی کے نقطۂ نظر پر گفتگو کی گئی ہے۔

۲۰۹۔ ابن شہاب الزہری، (۵۱ تا ۱۲۱ھ) المغازی النبویہ/ دارالفکر، دمشق ۱۹۸۱ء/ ص۴۴)

۲۱۰۔ ابن اسحاق/ ص۱۳۳۔

۲۱۱۔ صحیح البخاری (روایت حضرت عائشہ سابقہ)/ ج۱،ص۴ نیز کتاب التعبیر/ ج۹،ص۳۸۔

۲۱۲۔ ایضاً

۲۱۳۔ ایضاً/ کتاب التفسیر/ ج۶،ص۲۱۵۔

۲۱۴۔ انصرک نصراً موزرا۔ ایضاً/ ج۱،ص۴۔ ج۶،ص۲۱۵۔ ج۹،ص۳۸۔

۲۱۵۔ ورقہ کا انتقال کب ہوا اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فضل الباری کے مطابق عام طور پر علماء کا یہی قول ہے کہ ورقہ نے زمانہ دعوت کو نہیں پایا۔ زمانہ فترۃ الوحی میں ہی انتقال ہوگیا، اس بنا پر (روایت میں مذکور) لم ینشب (کے الفاظ) کا مطلب ظاہر ہے کہ ورقہ زیادہ زمانہ نہیں بچے البتہ کتب سیر میں بعض روایات ایسی ہیں کہ انہوں نے زمانہ دعوت بھی پایا۔ حتی کہ یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ جب بلال رضی اللہ عنہ پر مصائب ڈھائے جاتے تھے اور وہ احد احد کہتے تو ورقہ وہاں سے گزرتے اور ساتھ ساتھ کہتے نعم احد، نعم احد اور اظہار افسوس کرتے مگر نشر دین اور ہجرت کا زمانہ نہیں پایا اور نہ وہ زمانہ پایا جس میں حضور ﷺ پر مصائب ڈھائے گئے، اس وقت لم ینشب کا یہی مطلب ہے کہ دین اچھی طرح پھیل جائے اور ان کو اپنی آرزو کے مطابق نصرت کا موقع ملے مگر ورقہ نے اتنی عمر نہیں پائی (دیکھئے: فضل الباری/ ج۱،ص۱۷۹) زمانہ فترۃ وحی کتنا رہا اس میں بھی اختلاف ہے۔ تین دن سے لے کر تین سال تک کی روایت ہے مگر روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھی خاصی مدت تھی خواہ چھ مہینے ہوں یا دو سال یا تین سال صرف تین دن نہیں تھی (ایضاً)۔ واٹ کے نزدیک بعض بیانات سے ورقہ کی موت

واقعہ غار حراء سے ۲ تا تین سال بعد ہوئی بلکہ بعض کے مطابق ۴ سال بعد بھی (محمایت مکہ/ص ۵۱)۔

۲۱۶۔ورقہ بن نوفل کے بارے میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا تبصرہ یہ ہے کہ ورقہ کے ناجی اور مومن ہونے پر سب کا اتفاق ہے، کیونکہ جب نصرانی تھے تو صحیح دین مسیحی پر تھے تحریف پر نہیں تھے، پھر جب رسول اللہ ﷺ کا بیان سنا تو آپ کی تصدیق کی اور آپ کی نصرت کی تمنا و آرزو کے ساتھ اس کا وعدہ کیا۔ بعض مرسل روایت میں تو یہاں تک آیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ تم وہی رسول ہو جس کی بشارت موسیٰ علیہ السلام نے دی تھی تو شہادت بھی پائی گئی، نیز حضور ﷺ کا خواب یہ ہے کہ ورقہ کو سفید ریشم کے لباس میں دیکھا جو جنتیوں کا لباس ہے، بعض روایات میں ہے کہ ان کو نہر جنت پر دیکھا، انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے اس لئے ورقہ بن نوفل کا مومن و ناجی ہونا یقینی ہے (فضل الباری/ ج ۱، ص ۱۷۷) آگے بحث ہے کہ اول المومنین کون ہے۔ فرماتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ سب سے پہلے مردوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عورتوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور اطفال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور موالی میں سے زید و بلال رضی اللہ عنہما ایمان لائے ہیں ورقہ کو کسی نے اول المومنین میں شمار نہیں کیا۔ شیخ اکبر کہتے ہیں کہ نبوت و رسالت میں فرق ہے، نبی صرف وحی آنے سے ہو جاتا ہے وہ وحی اس کی ذات تک محدود ہوتی ہے اور جب تبلیغ کا حکم ہوا تو وہ رسول ہو گیا (ایضاً) آگے تفصیل دی ہے ''ورقہ کو زمانہ فترۃ وحی کا مومن کہنے کی صورت میں تو کوئی بحث ہی نہیں۔ہاں اگر دور دعوت و رسالت کا مومن کہا جائے تو یہ اس امت کے پہلے مومن اور پہلے صحابی ہوں گے۔ عام طور پر علما نے کہا ہے کہ ورقہ نے دعوت سے پہلے تصدیق کی تھی اور دعوت کے بعد ایمان لانے والوں میں ابوبکر وغیرہم کو اول المومنین کہا جاتا ہے۔ ہم نے عام طور پر اس لئے کہا کہ بعض علماء بھی ہیں جنہوں نے ان کو اس امت کا مومن قرار دیا ہے، ان میں سے ایک حافظ زین الدین عراقی دوسرے شیخ سراج الدین بلقینی ہیں، اور یہ دونوں حافظ ابن حجر کے مشائخ میں سے ہیں، انہوں نے صحابہ کے حالات پر مستقل کوئی تصنیف نہیں کی مگر اپنی اپنی تصانیف میں اس بات کا ذکر کیا ہے، اور جنہوں نے صحابہ کے حالات پر مستقل تصانیف کی ہیں ان میں حافظ ابن منذر، ابن جریر طبری، بغوی، ابن قانع اور ابن السکن ہیں اور متاخرین میں سے جن کی تصانیف ہمارے ہاتھوں میں ہیں حافظ عبد البر کی الاستیعاب اور ابن الاثیر کی اسد الغابہ اور حافظ ابن حجر کی الاصابہ ہے۔ ان سب لوگوں نے ورقہ کو اسی امت کا مومن قرار دیا اور اصحابی شمار کیا ہے، کیونکہ انہوں نے تصدیق کے ساتھ ساتھ نصرت کی آرزو کی اور اس کا وعدہ کیا اس قول کی بنا پر امت کے پہلے مومن اور اول الصحابہ ورقہ ہوں گے (ایضاً/ص ۱۷۸)۔ علاوہ ازیں حدیث و سیر کے دوسرے مآخذ سے بھی ورقہ کے مقام و مرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً جب ورقہ کا انتقال ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے ایک نصرانی عالم کو جنت میں دیکھا ہے ریشم کا لباس زیب تن کئے ہوئے کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور اس نے میری تصدیق کی تھی (ابن اسحاق/ص ۱۳۳)۔ ابن کثیر کے مطابق ورقہ ایمان لے آئے تھے، الفصول فی سیرت الرسول/ مکتبہ دار التراث المدینہ المنورہ، ۱۴۰۳ھ/ص ۹۸۔ اور ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خواب میں ورقہ کو اچھی حالت میں دیکھا (ایضاً) امام احمد کے ہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ورقہ کے بارے آنحضور ﷺ سے دریافت فرمایا تو آپ ﷺ نے کہا ''میں نے اسے دیکھا تو سفید لباس میں تھا اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ جہنمی ہوتا تو اس پر کپڑے نہ ہوتے''۔ (ایضاً)

jo\Alsera

مسلمان ہونے کی صورت میں یہ اعتراض جسے حافظ ابن حجر کے حوالے سے مولانا شبلی نے بھی نقل کیا ہے(سیرت النبی / ج ا،ص ۲۰۵) کہ کسی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین ہو سکتی ہے" خود بخود رفع ہوجاتا ہے۔

۲۱۸۔واٹ نے (محمد ایٹ مکہ) میں لکھا ہے کہ ورقہ نے اگر چہ (حضرت) محمد (ﷺ) کی تصدیق و تائید کی تھی لیکن وہ مسلمان نہیں ہوا (ص ۵۱) (Warqah though he approwed Muhammed (SAW) did not become a muslim) بلکہ وہ یہ تاثر قائم کرنا چاہتا ہے کہ ورقہ کی طرف سے تسلی وتشفی دراصل یہ سمجھانے کے لئے تھی کہ آپ ﷺ پر جو کچھ نازل ہوا وہ صحائف عیسوی وموسوی سے ملتی جلتی چیز ہے۔

۲۱۹۔حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ورقہ بن نوفل سے قریبی تعلق تھا، دونوں قریش کے خاندان بنو اسد سے تھے۔آپس میں چچا زاد، تایا زاد بہن بھائی (ابن ہشام / ج ا،ص ۱۶۴، ۲۰۳، ۲۵۴) ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا ظاہر ہے اور بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔اپنی شادی سے پہلے جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنا مال تجارت، کاروباری طور پر آنحضرت ﷺ کے حوالے کیا اور اپنے غلام میسرہ کو بھی ساتھ میں روانہ کیا، واپسی کے سفر کے بعد میسرہ کے ذریعے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو نہ صرف کاروباری منافع کی اطلاع ملی بلکہ میسرہ نے دوران سفر حضور ﷺ کے فضائل وکمالات اور علامات نبوت کے سبب راہب کی طرف سے بشارت کا پورا ماجرا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سنایا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ورقہ کے سامنے ان غیر معمولی علامات وواقعات کو دہرا دیا، واقعات کے پیش نظر جناب ورقہ نے حضرت خدیجہ کو صاف صاف کہہ دیا کہ اگر یہ سب باتیں یہی تھیں اور اسی طرح پیش آئیں تو خدیجہ یہ اچھی طرح جان لو کہ بے شک محمد (ﷺ) اس امت کے نبی ہوں گے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ نبی منتظر کی حیثیت رکھتے ہیں (ابن ہشام / ج ا،ص ۲۰۳) یہ بعثت ونبوت سے تقریباً ۱۶ سال پہلے کی بات ہے۔اس وجہ سے غار حراء کا واقعہ اور نزول وحی الٰہی دراصل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لئے (۶۱۰ء میں) تحیر انگیز ثابت نہ ہوا اور انہوں نے فی الفور یہ کہہ دیا: **فوالذی نفس خدیجة بیدہ انی لارجو ان تکون نبی ھذہ الامة** (ایضاً / ص ۲۵۴) جناب ورقہ کے پاس بعد میں لے گئیں۔پہلی تصدیق تو خود انہوں نے فرمائی تھی۔

۲۲۰۔ایک مرتبہ جب آپ ﷺ کے ہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو اس وقت حضور گھر پر موجود نہ تھے۔حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ کا ماجرا سنایا اور ان سے کہا اے عتیق تم محمد ﷺ کو ورقہ کے پاس لے جاؤ، چنانچہ دونوں حضرات ورقہ کے پاس گئے (ابن اسحاق / ص ۱۲۲)

۲۲۱۔حضرت ابوبکر کی معیت میں جب آنحضرت ﷺ ورقہ کے پاس گئے تو ورقہ نے پھر آنے کی ہدایت کی تھی۔چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد کے بعد ورقہ کے پاس، آنحضور ﷺ پھر سے گئے تو ورقہ نے آپ ﷺ کو نبوت ورسالت کی بشارت دی اور کہا کہ آپ تو نبی مرسل ہیں آپ کو عن قریب جہاد کا حکم دیا جائے گا، اگر میری عمر نے وفا کی تو میں آپ ﷺ کی پرزور مدد کروں گا (ابن اسحاق / ص ۱۳۳) غار حراء میں اپنی خلوت گزینی کے خاتمے پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے معمول کے مطابق پہلے خانۂ کعبہ کا طواف کیا۔طواف کے دوران آپ ﷺ کی ملاقات ورقہ سے ہوگئی۔اس نے آپ سے پوچھا: کیا دیکھا سنا؟ حضور ﷺ نے اپنا تمام قصہ سنایا، ورقہ نے تصدیق نبوت ورسالت کی اور پوری بات دہرادی۔(ابن اسحاق / ص ۱۲۳۔ابن ہشام / ج ا،ص ۲۵۴)

۲۲۲۔ابن اسحاق / ص ۲۰۰